منکرینِ حدیث کے

چار اعتراضات

اور ان کا علمی و تحقیقی جائزہ



تالیف
عبدالرحمٰن کیلانی



تخریج وحواشی
ابو یاف اعجاز احمد تنویر

Dar-ul-Andlus

نام کتاب

منکرینِ حدیث کے

چار اعتراضات

اوران کا علمی وتحقیقی جائزہ

تالیف

فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

تخریج وحواشی

ابوسیاف اعجاز احمد تنویر حفظہ اللہ



ملنے کا پتہ

دارالاندلس

لیک روڈ، چوبرجی لاہور، پاکستان

Fax: 92-42-7242639 www.dar-ul-andlus.com

منکرینِ حدیث کے

چار اعتراضات

اور ان کا علمی و تحقیقی جائزہ



عبدالرحمن کیلانی

ابوسیاف اعجاز احمد تنویر

فہرست مضامین

اعتراض نمبر 1

حدیث ظنی علم ہے اور ظن دین نہیں ہو سکتا



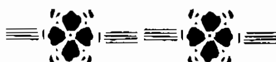
تاریخ اور حدیث کا فرق



کثرت احادیث



”طلوع اسلام“ کا معیار حدیث



مسنون خطبہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ وَكُلَّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ

''بلاشبہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے، اسی سے مدد مانگتے اور اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ راہ دکھائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ دھتکار دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

''حمد وصلوۃ کے بعد! یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ کی کتاب اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام امور میں سے برے کام (دین میں) خودساختہ (بدعت والے) کام ہیں، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔''

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا

كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○

''اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم مسلمان ہو۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (پھر) اس سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلا دیا۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے (بچو)۔ یقیناً اللہ تم پر نگران ہے۔ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی اور کھری) بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔''



① ((مسلم' الجمعة' بابا تحفيف الصلوة و الخطبة' حديث ٨٦٨ و ٨٦٧۔ والنسائي' ٣٢٧٨))

② ((رواه الاربعة واحمد والدارمي و روى البغوى في شرح السنة مشكوة مع تعليقات الالباني' النكاح' باب اعلان النكاح ... وقال الالباني حديث صحيح۔))

تنبیہات:

➤ صحیح مسلم' سنن نسائی اور مسند احمد میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث میں خطبہ کا آغاز ((ان الحمدلله)) سے ہے لہٰذا ((الحمدلله)) کی بجائے ((ان الحمدلله)) کہنا چاہیے۔

➤ یہاں ((نومن به ونتوكل عليه)) کے الفاظ صحیح احادیث میں موجود نہیں ہیں۔

➤ یہ خطبہ نکاح' جمعہ اور عام وعظ وارشاد یا درس وتدریس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اسی خطبہ حاجت کہتے ہیں اسے پڑھ کر آدمی اپنی حاجت وضرورت بیان کرے۔

پیش لفظ

میرے مطالعہ کی حد تک فتنۂ انکارِ حدیث کے بنیادی اسباب دو ہیں:

① فلسفہ اور سائنٹیفک نظریات سے مرعوبیت، جسے یہ حضرات ''موجودہ دور کی علمی سطح کے مطابق'' کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔

② اتباع نفس، یعنی احکام قرآنیہ کی وہ تشریح جو آپ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے پیش فرمائی اس کو '' تَكْلِيفُ مَا لَا يُطَاق'' سمجھ کر اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنا، جیسا کہ موجودہ دور میں ادارہ ''طلوع اسلام'' نے ''مرکز ملت'' کو یہ حق عطا فرمایا کہ وہ قرآن کے احکام اور اصولوں کی جزئیات موجودہ دور کے تقاضوں کے مابین متعین کرے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر ان حضرات کا شروع سے طریق کار بھی ایک ہی جیسا رہا ہے۔ یعنی پہلے سنت میں تشکیک (شک و شبہ) کے پہلو تلاش کر کے سنت کو ناقابل اتباع قرار دینا۔ پھر اس کے بعد اخبار و آثار سے مطلقاً آزاد ہو کر لغت کے حوالہ سے قرآن کی من مانی تاویلات پیش کرنا۔ معتزلہ نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ آج ہمارے یہ دوست بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

زیر نظر مقالہ دراصل میری مبسوط تصنیف ''آئینہ پرویزیت'' کا ایک باب ہے جسے

''سلفیہ رائزنگ انجینئرز'' فوری طور پر چھپوانا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کے آٹھ دس مضامین ماہنامہ ''محدث'' اور ''ترجمان الحدیث'' میں پہلے چھپتے رہے ہیں، کتاب مذکور کے درج ذیل چھ حصے ہیں:

۱۔معتزلہ سے ''طلوع اسلام'' تک:

اس حصہ میں انکار حدیث کے آغاز سے لے کر آج تک اس کے ''فکر قرآنی'' کے ارتقاء کی داستان تفصیل سے مذکور ہے۔

۲۔''طلوع اسلام'' کے مخصوص نظریات:

اس حصہ میں ''طلوع اسلام'' کے مخصوص نظریات مثلاً:

① حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ ② عجمی سازش ③ مسئلہ ارتقاء

④ مساوات مرد وزن ⑤ مرکز ملت ⑥ نظام ربوبیت

۳۔قرآنی مسائل:

یہ حصہ ''طلوع اسلام'' کی تصنیف ''قرآنی فیصلے'' کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

۴۔دوام حدیث:

اس حصہ میں حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کے ان مقامات کا جواب دیا گیا ہے اور ان اعتراضات کا بھی جو پرویز صاحب نے ''مقام حدیث'' میں اٹھائے ہیں۔

۵۔دفاع حدیث:

اس حصہ میں مجموعہ احادیث کے داخلی امور پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو

''طلوع اسلام'' کی مطبوعہ کتاب ''مقام حدیث'' میں مذکور ہیں۔

۶۔ ''طلوع اسلام'' کا اسلام:

اس حصہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حجیت حدیث سے انکار کے بعد ''طلوع اسلام'' کس قسم کا اسلام پیش کرتا ہے؟

کتاب کے آخر میں '' طلوعِ اسلام'' سے ''چند بنیادی سوالات'' بطور ضمیمہ شامل کیے گئے ہیں۔

زیر نظر کتاب '' حدیث رسول ﷺ پر چند بنیادی اعتراضات کا جواب'' پانچویں حصہ ''دفاع حدیث'' کا ایک باب ہے۔ جس میں چار زبان زد عام اعتراضات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جو یہ ہیں:

1. کیا ''ظن'' دین بن سکتا ہے؟
2. کیا واقعی حدیث اور تاریخ ایک ہی سطح پر ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے؟ (تقابلی جائزہ)
3. کثرت احادیث مثلاً یہ اعتراض کہ امام بخاری کو چھ (۶) لاکھ احادیث یاد تھیں وہ آ کہاں سے گئیں اور پھر گئیں کدھر؟
4. طلوع اسلام والوں کے ہاں معیار حدیث کیا ہے؟

عبد الرحمٰن کیلانی (رحمہ اللہ)

ابتدائے نگارش

قرآن مجید ایک ایسی کتابِ دستور و آئین ہے جس میں اصول وکلیات بیان ہوئے ہیں اور اسلامی نظام کی فکری اور اخلاقی بنیادیں خوب واضح کی گئیں ہیں۔ جہاں تک اسلامی زندگی کی عملی صورت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اللہ رب العزت نے نبی مکرم، رسولِ معظم، ہادیٔ اعظم جناب محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ تا کہ وہ قرآن حکیم میں بیان کیے ہوئے اصول وکلیات ،دستور وآئین اور قانونی متن کی وضاحت کریں۔ اور زندگی کے ایک ایک پہلو اور شعبہ کے متعلق تفصیلی قوانین بتائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

① ﴿ وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (النحل=١٦:٤٤)

"یہ ذکر (قرآن مجید) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے (اس لیے) کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں۔ شاید کہ وہ غور وفکر کریں ○"

② ﴿ وَ مَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ (الحشر=٥٩:٧)

”اور تمھیں جو کچھ رسول دے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔“

③ ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۚ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۚ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النور=٢٤:٥٤)

”(اے نبی کریم ﷺ!) کہہ دیجیے! اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول اللہ (ﷺ) کا حکم مانو۔ پھر بھی اگر تم نے روگردانی کی تو (یاد رکھو) رسول کے ذمے تو صرف وہی ہے جو اس پر لازم کر دیا گیا اور تم پر اس کی جوابدہی ہے جو تم پر لازم کیا گیا ہے۔ ہدایت تو تمھیں اسی وقت ملے گی جب تم رسول اللہ (ﷺ) کا حکم مانو گے۔ (سنو) رسول اللہ (ﷺ) کے ذمے تو صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے۔“

④ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ (النساء=٤:٨٠)

”اس رسول (ﷺ) کی جو اطاعت کرے اسی نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اور جو منہ پھیر لے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔“

⑤ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ﴾ (محمد=٤٧:٣٣)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول اللہ (ﷺ) کا حکم مانو اور

اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔"

⑥ ﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى ۝ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ (النّجم=۵۳: ۱۔۴)

"قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے کہ تمہارا ساتھی (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) راستہ نہیں بھولا اور نہ ہی وہ غلط راہ پر چلا ہے۔ اور نہ ہی اپنی خواہش سے کوئی بات کہتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو (اس کی طرف) اتاری جاتی ہے۔"

⑦ ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ﴾
(النّساء=۴: ۶۵)

"سو قسم ہے تیرے پروردگار کی! یہ لوگ ایمان دار نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام آپس کے اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ آپ ان کے درمیان کر دیں اس سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔"

مندرجہ بالا سات فرامین الٰہی فقط بطور نمونہ کے پیش کیے گئے ہیں ورنہ ان جیسی قرآن مجید میں سینکڑوں آیات ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحبِ منصبِ رسالت جناب محمد کریم ﷺ کی شخصیت کو قرآن کریم میں بیان کردہ اصول و کلیات کے سمجھنے کے لیے بڑا عمل دخل ہے۔ قرآنی ہدایات و تعلیمات کے مطابق اسلامی زندگی کی عملی صورت کا نام حدیث رسول اور سنت رسول ہے۔ حدیث رسول ہی قرآن کے معنی و

مفہوم کو متعین کرتی ہے اور قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ بتاتی ہے۔ یہ حدیث رسول ﷺ ہی ہے جو قرآن مجید کو بازیچۂ اطفال بنانے سے باز رکھتی ہے۔ تا کہ کوئی ملحد وزندیق آیاتِ قرآنیہ کو اپنی من مانی تاویلات اور آراء فاسدہ کی بھینٹ نہ چڑھا سکے۔

لیکن دورِ حاضر کے بعض جدّت پسندوں اور روشن خیالوں کو یہ قطعاً گوارا نہ تھا کہ مسلمانوں میں قرآن وسنت کی خالص تعلیمات رواج پا سکیں۔قرآن مجید کا انکار تو خیر، ان کے بس کا روگ نہ تھا البتہ انھوں نے حدیث رسول کو اپنا ہدف بنا کر حدیث رسول کو حجتِ شرعی ماننے سے انکار کردیا۔

دین اسلام کے اس باغی گروہ اور امت منکرہ نے اپنی جدّت پسندی، ترقی، روشن خیالی، آزاد خیالی، سیکولر ازم، لبرل ازم، بے پردگی، بے حجابی، عریانی اور فحاشی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حدیث رسول ﷺ کو سدِ راہ سمجھا۔ لہٰذا بعض نے کھلے الفاظ میں اور بعض نے دبے الفاظ میں حدیث کو ماننے سے انکار ہی کردیا۔

فتنہ انکارِ حدیث اگرچہ خوارج ومعتزلہ کا کھڑا کیا ہوا ہے۔مگر برّصغیر پاک وہند میں اس ''شجرزقوم'' کی آبیاری کا شرف سب سے پہلے سرسید احمد خان کے حصے میں آیا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ حافظ اسلم جیراجپوری نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا۔ غلام جیلانی برق، قاسم نوری اور علی محمد چدھڑ نے بھی اس ''شجرۂ خبیثہ'' کو پانی ڈالا۔ مگر پاکستان میں سب سے زیادہ انکار حدیث کا فکر فاسد ایرانی کافر بادشاہ خسرو پرویز کے ہم نام مسٹر پرویز احمد نے عام کیا۔ وہی فکر فاسد فی ہذا الوقت مسٹر جاوید احمد غامدی عام کررہے ہیں۔ وہ لوگ جن کو اسلام کی پابندیاں اور شریعت کی حدود وقیود ناگوار تھیں۔

انھوں نے فوراً اس فکر فاسد پر لبیک کہا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسٹر پرویز کا ہم نام اسلامیان پاکستان کا صدر روشن خیالی، جدّت پسندی اور اعتدال پسندی کے نام سے کفر والحاد، لادینیت اور بے راہ روی پھیلا رہا ہے۔ کبھی شرعی سزاؤں اور حدود اللہ کا مذاق اڑاتا ہے تو کبھی قرآن وسنت کے پابند مردوں کی داڑھی اور شریعت کی پابند عورتوں کے پردے کا تمسخر اڑاتا ہے۔ گویا جو نظریات مسٹر پرویز اپنی عقلِ عیار کے بل بوتے پر ٹھونسنا چاہتا تھا وہی نظریات آج ڈنڈے اور اقتدار کے زور پر اہل پاکستان پر ٹھونسے جا رہے ہیں۔

فتنۂ انکار حدیث کے قلع قمع کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں ایسے افراد پیدا کیے جنھوں نے اس کی خوب خوب خبر لی۔ چنانچہ اس موقع پر برصغیر پاک وہند کی صرف دو بڑی نامور اور قد آور شخصیات کے دو اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

① محترم سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جن لوگوں کی نظر مِلَل ونِحَل اور علمِ کلام وعقائد اور تاریخِ فِرَق پر ہے وہ آسانی سے اس بات کو مان لیں گے کہ اسلام میں جتنے بدعتی (گمراہ اور بدراہ) فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنھوں نے کتاب کو سنت سے یا سنت کو کتاب سے الگ کرنا چاہا۔ خوارج نے کتاب اللہ کو مانا اور سنت رسول سے انحراف کیا۔ ان کے مقابل فرقہ نے کتاب کو محرَّف (تبدیل شدہ) بنا کر چھوڑا اور صرف اپنے ائمہ کی پیروی کا دعویٰ کیا۔ اسی طرح معتزلہ نے قرآن کو بتاویل تسلیم کیا اور حدیث سے اعراض کیا اور راہ راست سے دور رہے۔

جو کچھ پہلے ہوا وہ آج بھی ہو رہا ہے۔ سر سید کے زمانہ سے احادیث کا فن نا آشنانِ فن کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ چونکہ ان کے خود ساختہ عقل کے معیار پر جو چیز پوری نہیں اترتی اگر وہ قرآن پاک کی کوئی آیت ہے تو اس کی دوراز کار تاویل اور اگر حدیث ہے تو اس کا انکار کر کے اپنے زعم میں اسلام کے چہرہ سے اس کے خلاف عقل ہونے کا داغ مٹانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ داغ سمجھ سمجھ کر خدا جانے اسلام کی صحیح تصویر کے کتنے اجزاء کو مٹا چکے ہیں۔"

② محترم الشیخ محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"دین کی وسعت میں انکارِ حدیث سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے پاٹنے کے لیے پون صدی کی کوششیں تو ہمارے سامنے ہیں۔ اس عرصہ میں بے چاری نماز ہی ان علماء کا تختۂ مشق بنی رہی۔ آج تک یہ اربابِ تحقیق نماز کے وقت، ہیئتِ اذکار، نوافل و فرائض، واجباتِ رکعات اور ارکان کا فیصلہ ہی نہیں کر سکے جو اتحاد کا نعرہ لگا کر اختلافات سے بچنے کا عہد لے کر نکلے تھے۔ اب تک سراپا اختلاف ہیں۔ صرف قرآن پر اکتفاء کرنے کے بعد وہ چند گھڑیاں بھی اتفاق سے نہیں گزار سکے۔" (حوالہ/ سنت قرآن کے آئینہ میں، صفحہ:۲٦)

پچھلی تین چار دہائیوں میں اس فتنہ پرور گروہ نے جو فتنہ پھیلایا۔ اس کی روک تھام کے لیے اللہ رب العزت نے محترم الشیخ عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ جیسی شخصیت کو پیدا کیا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ انھوں نے "فتنۂ پرویزیت" کا خوب رد کیا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ضخیم اور مبسوط کتاب "آئینہ پرویزیت" تصنیف کی۔ اس کتاب کو مصنف رحمہ اللہ

نے چھ حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے پانچواں حصہ ''دفاع حدیث'' ہے۔ اس حصہ میں مجموعہ احادیث کے داخلی امور پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''مقام حدیث'' میں مذکور ہیں۔

پھر اس پانچویں حصے ''دفاع حدیث'' کو مصنف رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل نو (۹) ابواب میں تقسیم کیا:

- باب اوّل: حدیث پر چند بنیادی اعتراضات
- باب دوم: حدیث اور چند نامور اہل علم وفکر
- باب سوم: جمع قرآن روایات کے آئینے میں
- باب چہارم: تفسیر بالحدیث
- باب پنجم: متعہ کی اِباحت وحرمت
- باب ششم: حصولِ جنت
- باب ہفتم: بخاری کی قابل اعتراضات احادیث
- باب ہشتم: خلفائے راشدین کی شرعی تبدیلیاں

پھر ان میں سے پہلے باب ''حدیث پر چند بنیادی اعتراضات'' کو مصنف رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل چار مباحث یا چار اعتراضات میں تقسیم کیا۔

- پہلا اعتراض: حدیث ظنی علم ہے اور ظن دین نہیں ہوسکتا۔
- دوسرا اعتراض: تاریخ اور حدیث کا فرق
- تیسرا اعتراض: کثرت احادیث
- چوتھا اعتراض: ''طلوع اسلام'' کا معیار حدیث۔

۱۹۸۶ء میں انجینئرنگ یونی ورسٹی لاہور کے سلفی طلباء کی تنظیم "سلفیہ رائزنگ انجینئرز" کی طرف سے پہلے تین اعتراضات اور ان کے جوابات پر مشتمل زیرنظر کتابچہ شائع کیا گیا۔ بعدازاں ۱۹۹۸ء میں اس کتابچہ کو اس کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر دوبارہ چھپوانے کا پروگرام بنا۔ اس وقت محترم انجینئر عبدالقدوس سلفی صاحب (حفظہ اللہ) دارالاندلس کے مسئول تھے اور مرکز الدعوۃ والارشاد کا دفتر ۵۔ چیمبرلین روڈ پر تھا۔ راقم الحروف نے دوبارہ اشاعت کے وقت اس کی احادیث کی تخریج بھی کردی، چند مقامات پر ضروری فٹ نوٹس (حواشی) بھی تحریر کردیے اور ساتھ ہی ساتھ پہلے باب کے چوتھے اعتراض "طلوع اسلام" کا معیار حدیث" کو بھی ساتھ شامل کردیا۔ جب دوسری دفعہ اس کتاب کو شائع کیا گیا تو اس کا نام "دفاع حدیث" رکھا گیا۔ اسی نام کے ساتھ یہ کتاب دارالاندلس کی طرف سے تاحال چھپ رہی ہے۔

اب کی بار اس کو چھپوانے کا ارادہ بنا تو راقم الحروف نے اس میں چند مزید اور مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ خاص طور پر اس کے "دوسرے اعتراض" میں درج ذیل پانچ باتوں پر حواشی قلمبند کیے:

① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واقعہ کے عینی شاہد ہیں جو کچھ وہ روایت کرتے ہیں خود آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر روایت کرتے ہیں۔

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کے پابند اور مأمور ہیں کہ جس ہستی کی تاریخ اور سیرت وہ مرتب کر رہے ہیں اس کی ایک ایک نقل و حرکت کو بغور ملاحظہ کریں، پھر اپنے آپ میں وہی خصوصیات پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کے بھی مأمور ہیں کہ اس سیرت طیبہ کو ان لوگوں تک

پہنچائیں جو غیر حاضر ہیں یا بعد میں آنے والے ہیں۔

④ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ جس ہستی کے وہ مؤرخ بننے والے ہیں اس کو اپنی جان سے عزیز سمجھیں۔

⑤ پھر ساتھ ہی ساتھ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ تلوار بھی لٹک رہی تھی کہ "جس نے مجھ پر کوئی جھوٹ باندھا یا کوئی غلط بات منسوب کی اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

مندرجہ بالا پانچوں باتیں اپنی جگہ اٹل اور بے بدل حقائق ہیں اور قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔ مگر بہرحال کتاب میں ان کی حیثیت محض "دعویٰ" کی تھی۔ اس لیے کہ مندرجہ بالا پانچوں باتیں اَدِلّہ و اَمثلہ کے بغیر تھیں۔ بندۂ ناچیز نے چند دنوں کی محنت کے بعد ان کو دلائل و واقعات سے مزین کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ اس ضمن میں اختصار کی کوشش کرتے ہوئے قدرے طویل حواشی نوٹ کیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کتاب کا نام "منکرین حدیث کے چار اعتراضات" اور ان کا علمی و تحقیقی جائزہ" رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دفاع حدیث تو مبسوط کتاب "آئینہ پرویزیت" کے مکمل چھٹے حصے کا نام ہے۔ کتاب کے مضامین کی مناسبت سے "منکرین حدیث کے چار اعتراضات" ہی زیادہ موزوں لگتا ہے۔ لہٰذا اب اسی نام سے اس کتاب کو شائع کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں تو منکرین حدیث کے چار اعتراضات کا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ اس کتاب کے ساتھ ہی ایک اور کتاب بھی دارالاندلس کی طرف سے شائع کی جارہی ہے۔ جو راقم الحروف نے خود تصنیف کی ہے۔ اس میں قرآن مجید کی روشنی میں "منکرین حدیث سے چار سوالات" کیے گئے ہیں۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ

حدیث رسول بھی قرآن کی طرح نازل شدہ وحی ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب کے مصنف الشیخ عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ کی حسنات میں اضافہ فرمائے اور حدیث رسول ﷺ کے حوالے سے بندۂ ناچیز کی اس کوشش کو قبول و منظور فرمائے، اس کو توشۂ آخرت بنائے، اس کو علم نافع بنائے اور روز محشر رسول اکرم ﷺ کی طرف سے اہل توحید کے حق میں ہونے والی ''شفاعت کبریٰ'' کا حقدار بنائے۔

اللہ تعالیٰ محترم سیف اللہ خالد صاحب (مدیر دارالاندلس) کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ جن کی ترغیب وتحریض بندۂ ناچیز کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوتی رہتی ہے۔

اللہ رب العزت میری تمام دینی کاوشوں کے اجر وثواب میں میرے والد گرامی (رحمہ اللہ) کو بھی شریک فرمائے۔ جن کی خواہشوں اور کوششوں کے نتیجے میں بندہ آج دین متین کی کچھ خدمت کرنے کے قابل ہوا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَ عَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَ اَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ............ (آمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ)

اَلْعَبْدُ الْفَقِيْرُ اِلٰى رَحْمَةِ اللّٰهِ الْقَدِيْرِ

ابوسیاف اعجاز احمد تنویر

۲۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۷ ہجری

(بمطابق ۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء)



پہلا اعتراض

حدیث ظنی علم ہے اور ظن دین نہیں ہو سکتا

ذخیرۂ کتب احادیث کو بے کار ثابت کرنے کے لیے ''طلوع اسلام'' نے جس موضوع پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ ظن اور یقین کی بحث ہے، پھر اس ضمن میں کئی ذیلی مباحث پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے، مقام حدیث کے پیش لفظ میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ:

''طلوع اسلام'' کا دعویٰ:

'' آپ کسی مسلمان سے پوچھئے وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ دین نام ہے قرآن اور حدیث کا۔ قرآن ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، خود خدا نے اسے دین کا ضابطہ قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حدیث بھی دین کا جزو ہے؟ یہ تھا وہ سوال جس پر ''طلوع اسلام'' نے غور کرنے کی دعوت دی۔ ''طلوع اسلام'' کا کہنا یہ تھا کہ اگر حدیثیں بھی دین کا جزو تھیں تو رسول اللہ ﷺ کو چاہیے تھا کہ جس طرح آپ نے امت کو قرآن دیا تھا اسی طرح اپنی احادیث کا ایک مستند مجموعہ بھی امت کو دے جاتے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔'' (مقام حدیث کا پیش لفظ)

مغالطے اور جھوٹ:

ہمارے خیال میں مندرجہ بالا چند سطور کے اقتباس میں جتنے فقرے ہیں اس سے زیادہ اس میں مغالطے دیئے گئے ہیں، جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

① آپ لکھتے ہیں: ''قرآن کے دین ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، خود خدا نے اسے دین کا ضابطہ قرار دیا ہے'' اب سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کو ہی دین کا ضابطہ قرار دیا ہے؟ ہمارے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے) کو دین کا ضابطہ قرار دیا ہے، (الانعام= ٥: ٤٥، ٤٧، ٤٩) اور ﴿بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ میں ہر قسم کی وحی شامل ہے۔ خواہ وہ قرآن میں مذکور ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ نیز ہمارے خیال میں ''طلوع اسلام'' قرآن کی ایک بھی ایسی آیت پیش نہیں کر سکتا جس میں یہ وضاحت ہو کہ دین صرف قرآن ہی ہے۔

② پھر ارشاد فرمایا: ''اگر حدیثیں بھی دین کا جزو تھیں تو جس طرح آپ نے امت کو قرآن دیا تھا اس طرح اپنی احادیث کا ایک مستند مجموعہ بھی امت کو دے جاتے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔'' اس ایک فقرہ میں دو جھوٹ ہیں اور ایک مغالطہ، جھوٹ یہ ہیں:

ا= اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کا تو کوئی مستند مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا البتہ قرآن کا مستند مجموعہ ضرور دیا تھا۔

ب= دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ ''لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا'' اس فقرہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کا تو مستند مجموعہ امت کو دیا تھا، لیکن حدیث کا نہیں دیا تھا۔ اس قضیہ (جملہ) کا پہلا حصہ ہی جب بے بنیاد ہو تو وہ دوسرے حصہ کے لیے بنیاد کا کیسے کام دے سکا ہے؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت قرآن پورے کا پورا تحریری شکل میں موجود تھا، تو کیا احادیث کا بھی کچھ سرمایہ تحریری طور پر موجود تھا؟ اس سوال کے جواب میں ہم پرویز صاحب کی تصنیف ''مقام حدیث'' ہی کے حوالوں سے یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت قرآن کے مواد کے لگ بھگ احادیث کا بھی تحریری سرمایہ موجود تھا جو آپ کے حکم، اجازت یا ترغیب کی بناء پر لکھا یا لکھوایا گیا تھا۔ [1]

مغالطہ اس فقرہ میں یہ ہے کہ آپ جاتے ہوئے امت کو کوئی مستند لکھا ہوا مجموعہ حدیث نہیں دیکر گئے۔ جب کہ ﴿بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ یا وحی ''مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ'' کے لیے قطعاً یہ ضروری نہیں کہ جب تک آپ اس وحی کی کتابت نہ کروا جاتے۔ وہ دین نہیں بن سکتی تھی۔ یہ ایسا مفروضہ ہے جو سراسر غلط ہے۔

ظن اور یقین کی بحث

''طلوع اسلام'' نے اپنے اسی دعویٰ کو ایک دوسرے انداز میں یوں دہرایا ہے:

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے: مصنف رحمہ اللہ کی مبسوط کتاب ''آئینہ پرویزیت'' کے حصہ چہارم کا باب دوم ''کتابت و تدوین حدیث''

''دین کے متعلق ایک چیز سے متعلق تو یقیناً آپ متفق ہوں گے۔ یعنی یہ کہ دین وہی ہوسکتا ہے جو یقینی ہو۔ ظنی اور قیاسی نہ ہو'' (مقام حدیث صفحہ:۴) پھر اس کے بعد قرآن کے یقینی ہونے سے متعلق چند آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس بات سے تو ہر مسلمان ''طلوع اسلام'' سے اتفاق رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں، بحث جہاں سے شروع ہوتی ہے وہ یہ بات ہے کہ بعض محدثین خود اعتراف کرتے ہیں کہ حدیث کا علم ظنی ہے، (حالانکہ قرآن نے اسے یقین کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے) لہٰذا ''طلوع اسلام'' نے محدثین کے اس قول اور عوام کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام تر مجموعہ احادیث کو ظنی اور قیاسی قرار دے دیا ہے اور یہی بات دراصل محل نزاع ہے۔

لفظ ''ظن'' کی لغوی بحث:

اس لغوی بحث میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھنا چاہتے بلکہ مفردات امام راغب سے اس کی تفصیل نقل کیے دیتے ہیں، جسے ''طلوع اسلام'' نے بھی لغات القرآن کے مقدمہ میں ایک مستند لغت کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور اس سے کافی حد تک استفادہ بھی کیا ہے۔

''کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے ''ظن'' کہتے ہیں۔ جب یہ علامات قوی ہوں تو ان سے علم کا درجہ حاصل ہوتا ہے مگر جب بہت کمزور ہوں تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے آگے تجاوز نہیں کرتا۔'' (۲)

(۲) دیکھئے مفردات القرآن (اردو ترجمہ) صفحہ نمبر: ۶۵۷، طابع و ناشر شیخ شمس الحق۔ اقبال ٹاؤن لاہور۔

''یہی وجہ ہے کہ جب نتیجہ قوی ہو اور علم کا درجہ حاصل کرے تو اس کے بعد ''أَنَّ'' یا'' أَن '' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آیات:

① ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ (البقرة=٢:٤٦)

''(اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنے والے وہ لوگ ہیں) جو یقین کیے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔''

② ﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ﴾ (البقرة=٢:٢٤٩)

''کہا ان لوگوں نے جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ بسا اوقات چھوٹی سی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پالیتی ہیں۔''

③ ﴿وَّظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ (القيامة=٧٥:٢٨)

''اور اس (جاں بلب شخص) نے یقین کر لیا کہ اب سب سے جدائی ہے۔''

مندرجہ بالا آیات میں ''ظن'' کا لفظ علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد امام راغب رحمہ اللہ نے مزید آٹھ (٨) قرآنی آیات سے استشہاد (استدلال) کیا ہے جہاں ظن کا لفظ علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جنہیں ہم طوالت سے بچنے کی خاطر نظر انداز کر رہے ہیں۔

پھر امام راغب رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''مگر جب وہ ظن کمزور ہو اور وہم کے درجہ سے آگے نہ بڑھے تو پھر اس کے ساتھ إِنْ یا إِنَّ استعمال ہوتا ہے۔ جو کسی قول یا فعل کے

عدم کے ساتھ مختص ہے“ (اور اس کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے۔ظن کے مقابلہ میں یقین، علم، حق یا اس جیسے دوسرے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ جو ظن کے معنی کو وہم کے ساتھ مختص کر دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ”ظن“ کا معنی ”وہم“ صرف اس صورت میں ہوگا جب اس کے لیے قرینہ موجود ہوگا۔اب ایسی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

① ﴿يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجٰهِلِيَّةِ﴾ (آل عمران۳=:۱۵٤)

”اور وہ (منافقین) اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناحق زمانۂ جاہلیت کے سے گمان رکھتے ہیں۔“

② ﴿وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ (النجم=۵۳:۲۸)

”بے شک (ظن) یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔“

③ ﴿وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ﴾ (الفتح=٤۸:٦)

”اور تاکہ (اللہ تعالیٰ) ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب سے دوچار کرے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں برے خیال رکھتے ہیں۔“

④ ﴿وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾

(الجاثية=٤۵:۳۲)

”اور جب کبھی کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے اور قیامت کے آنے میں

کوئی شک نہیں تو (کافرو!) تم جواب دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ ہم تو اسے محض وہم ہی خیال کرتے ہیں اور اس پر یقین نہیں رکھتے علیہم السلام''

''طلوع اسلام'' کی دیانت:

اب ''طلوع اسلام'' کی دیانت یہ ہے کہ لفظ ''ظن'' کی بحث میں قرآن سے صرف ایسی آیات پیش کرے گا۔ جہاں لفظ ''ظن'' کا معنی وہم و قیاس ہو اور ایسی آیات کو یکسر نظر انداز کر دے گا جن میں ''ظن'' یقین یا علم کے معنی دیتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایسی آیات جن میں ''ظن'' علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ان آیات سے بہت زیادہ ہیں، جن میں ''ظن'' بمعنی وہم و گمان استعمال ہوا ہے۔

محدثین کے نزدیک لفظ ''ظن'' کا مفہوم:

بلا شبہ بعض محدثین نے علم حدیث کے لیے ''ظن'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس سے ان کی ایسی مراد ہرگز نہ تھی جیسا تاثر ''طلوع اسلام'' دینا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ اس لفظ ظن کو ان جملہ پہلوؤں میں لیتے تھے۔ جن پر قرآن کریم نے روشنی ڈالی ہے یا جو مفاہیم اس زمانے میں مستعمل تھے۔ جن کی وضاحت محدثین نے کر دی ہے۔ مثلاً:

① سُنَنِ مُتَوَاتِرَہ وَمُتَعَامِلَہ:

جن پر امت دور صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف کاربند چلی آ رہی ہے اور ان کا ذکر احادیث میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً یہ کہ نمازوں کی تعداد پانچ ہے۔ نماز کی ادائیگی کی ترکیب، رکعات کا تعین، حج اور زکوۃ کی ادائیگی کے طریقے، نکاح وطلاق، قوانین

عدل و انصاف اور اسلامی عدالتوں کا طریق کار، انفرادی عقائد و اعمال۔ اس لحاظ سے احادیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے۔ جو بغیر کسی انقطاع کے نَسلاً بَعدَ نَسلٍ کروڑ ہا انسانوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ یہ تعاملِ امت قطعی اور یقینی ہے۔

۲ احادیثِ مُتَوَاتِرَہ:

بعض ایسی احادیث بھی ہیں جن کا عمل سے نہیں بلکہ عقیدہ سے تعلق ہوتا ہے مثلاً:

① ...... «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» ③

② ...... «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» ④

یہ احادیث متواترہ ہیں۔ ان سے بھی یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔

۳ حدیث عزیز اور مشہور:

حدیث عزیز وہ ہوتی ہے جس کے راوی ہر سطح پر دو ہوں اور وہ عادل وضابط بھی

③ ترجمہ: "تمام اعمال کا دارومدار صرف نیتوں پر ھے"
تخریج: (صحیح البخاری= بَدْءُ الوَحْيِ (قَبْلَ كِتَابِ الايمَانِ): بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ، الحدیث: ۱+صحیح مسلم= كِتَابُ الْإِمَارَةِ: بَابُ قَوْلِهِ ﷺ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))، الحدیث: ۱۹۰۷

④ ترجمہ: "میرے ذمے جو کوئی بات جان بوجھ کر لگائے حالانکہ میں نے وہ نہ کھی ھو تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ کی)آگ میں بنالے۔
تخریج: (صحیح البخاری= كِتَابُ الْعِلْمِ: بَابُ إِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، الحدیث: ۱۰۷+ صحیح مسلم= الْمُقَدِّمَة: بَابُ تَغْلِيظِ الْكِذْبِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ۔

ہوں اور حدیث مشہور وہ ہے، جس کے راوی ہر سطح پر دو سے زیادہ رہے ہوں۔ ایسی احادیث سے واضح دلائل کی بناء پر گمان غالب حاصل ہوتا ہے۔

۴ حدیثِ غریب:

ایسی حدیث ہے جس کا راوی کسی سطح پر صرف ایک ہی رہ گیا ہو۔ عزیز، مشہور اور غریب تینوں خبر واحد کی قسمیں ہیں، ایسی ہی احادیث ہیں جن کے متعلق محدثین نے ''ظنی علم'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

لیکن یہاں بھی ظن کے ساتھ علم کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہاں بھی ''ظن'' وہم اور شک کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ محدثین نے پہلے روایت اور درایت کے معیار مقرر کیے۔ پھر ان معیاروں پر حدیث کو جانچا اور پرکھا۔ پھر بعد میں ہر حدیث کے متعلق کھلے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کردی کہ یہ حدیث ہماری تحقیق کے مطابق صحیح ہے یا حسن، ضعیف ہے یا موضوع، یا کہ متروک۔ اور ظن کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ روایت ودرایت کی جانچ پڑتال کی تمام تر کوششیں بہر حال انسانی ہیں، جن میں سہو وخطا کا امکان ہے۔ لہٰذا اس تحقیق وتنقید کے میدان کو بعد میں آنے والے محدثین کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے۔ تا کہ متعلقہ محدث کی تحقیق کے بعد بھی تحقیق وتنقید کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ مثلاً امام ابن حجر عسقلانی نے بخاری ومسلم کے بعض رجال پر تنقید کی ہے۔ حالانکہ ان دونوں کتابوں کو صَحِیحَین کہا جاتا ہے۔

''طلوع اسلام'' کا احادیث پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اقوال منسوب اِلَی الرَّسُوْل کی دو قسمیں ہونی چاہئیں کہ آیا وہ صحیح ہے یا غلط؟ یہ کیا ہوا کہ کسی حدیث کو

صحیح کہہ دیتے ہیں، کسی کو حسن، کسی کو ضعیف، کسی کو متروک وغیرہ وغیرہ، تو ہمارے خیال میں ''طلوع اسلام'' کا یہ اعتراض لاعلمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ قبولیت کے لحاظ سے احادیث کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک مقبول دوسری مردود (''طلوع اسلام'' کے الفاظ میں ایک صحیح اور دوسری غلط) پھر صحت و عدم صحت کے لحاظ سے مقبول اور مردود احادیث کی کئی اقسام ہیں۔ جو فن حدیث کی وسعت اور تبحر علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اب جو لوگ ان علوم سے بے بہرہ ہوں یا ان سے کچھ دلچسپی نہیں رکھتے انہیں اس کی کیا قدر ہو سکتی ہے؟

وہ اپنی لاعلمی کی بناء پر ان اقسام پر اعتراض نہ کریں تو کیا کریں؟ اپنی استعداد سے بڑھ کر جو کام انھوں نے شروع کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے کہ ان علوم سے بے بہرہ لوگوں کو شک میں ڈال کر انھیں اس علم سے بدظن کرتے ہیں۔

حدیثِ مقبول کی اقسام:

الغرض مقبول حدیث مندرجہ ذیل اقسام میں سے کوئی ایک ہو سکتی ہے:

① متواتر ② مشہور ③ عزیز ④ غریب
⑤ صحیح ⑥ حسن ⑦ محکم ⑧ محفوظ
⑨ معروف ⑩ مُرسَلُ الصَّحَابِی ⑪ مُختَلَفُ الحَدِیث
⑫ ناسخ ⑬ مُسَلسَلُ التَّامُ

(نمبر ۲ اور ۳ کو اکثر علماء نے خبر واحد ہی کی قسم بتلایا ہے)

حدیثِ مردود کی اقسام:

جب کہ مردود حدیث کی درج ذیل اقسام ہیں:

① موضوع ② متروک ③ ضعیف ④ مضطرب
⑤ شاذ (محفوظ کی ضد) ⑥ منکر (معروف کی ضد) ⑦ مُعَلَّل
⑧ مُعضَل ⑨ منقطع ⑩ مقلوب ⑪ منسوخ
⑫ مبہم ⑬ مُرسَل الخَفِیّ ⑭ مُرسَلُ التَّابِعِین

ان اقسام کی تشریح وتوضیح اس مقام پر نہ ہمارا موضوع ہے اور نہ ہی یہ سردست ممکن ہے۔ تاہم اس مختصری وضاحت سے بھی دو باتوں کا ضرور پتہ چلتا ہے: ایک یہ کہ محدثین نے اس فن کو کس حد کمال تک پہنچایا ہے اور دوسرے یہ کہ ان میں جرح کا پہلو تعدیل کے پہلو سے بہرحال غالب رہا ہے اور یہ اس تحقیق وتنقید کا تقاضا تھا۔

عقلوں کا فرق:

ہم اس بات کے تو حق میں ہیں کہ ایسی احادیث پر مزید جرح وتنقید کا عمل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی لازم ہے کہ یہ حق کسی ماہرفن ہی کو دیا جاسکتا ہے جیسا کہ بعد میں آنے والے بعض محدثین نے اس حق کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس بات کے حق میں قطعاً نہیں کہ ہرکس وناکس جو علوم حدیث کی ابجد بھی نہ سمجھتا ہو، محض اپنی عقل کو معیار بنا کر اس ذخیرۂ کتب احادیث پر تیشہ چلانا شروع کردے۔ کیونکہ عقل ہر ایک کی اپنی اپنی ہوتی ہے۔ محدثین روایت ودرایت کے تمام اصولوں کے تحت ایک حدیث کو مقبول قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک عام آدمی جو فن حدیث سے بے بہرہ ہے اپنی کوتاہ عقلی کی وجہ سے اسے مردود قرار دیتا ہے تو اس حدیث کو مردود قرار دینے کی بجائے اسے اس ناتمام عقل کی کوتاہی سمجھا جائے گا۔

ظنِ غالب پر دین کی بنیادیں

نگاہِ بازگشت:

اب آگے بڑھنے سے پیشتر ''طلوع اسلام'' کے تمام اعتراضات کو ایک دفعہ پھر سامنے لایے، جو یہ ہیں:

① اگر احادیث بھی دین کا حصہ تھیں۔تو رسول اللہ ﷺ نے جس طرح قرآن کا مستند نسخہ لکھوا کر امت کے حوالہ کیا تھا۔ احادیث کا ایسا مستند مجموعہ لکھوا کر امت کے حوالہ کیوں نہ کیا؟

② قرآن سے ''یقینی علم'' حاصل ہوتا ہے لیکن احادیث کے متعلق محدثین کا اپنا اعتراف ہے کہ ان سے ''ظنی علم'' حاصل ہوتا ہے اور ظن دین نہیں بن سکتا۔

③ خبر متواتر سے فی الواقعہ ''یقینی علم'' حاصل ہوتا ہے لیکن خبر متواتر کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ (گویا خبر متواتر کی اصطلاح بیکار محض ہے)

④ حافظ اسلم صاحب [⑤] نے ابو علی جبائی معتزلی کی تائید میں یہ اقرار تو کر لیا کہ

⑤ یہ شخص منکرین حدیث کا ایك مبلغ اور بہت بڑا وکیل تھا۔ انکار حدیث کی تائید و حمایت میں اس نے بہت کام کیا ہے۔ محترم الشیخ عبد الرحمن کیلانی صاحب نے اس کے باطل اور مردود نظریات کا اپنی کتاب آئینہ پرویزیت کے "چوتھے حصے" میں خوب رد کیا ہے۔اس کا پورا نام حافظ محمد اسلم جیراجپوری ہے۔ یہ شخص بھارت (یو-پی) کے ضلع اعظم گڑھ کے ایك قصبہ"جیراج پور" میں ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں "پیسہ اخبار" لاھور میں عربی کا مترجم اور ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کا استاد رھا۔ اس کی بڑی تصنیف "تاریخ الامت" (آٹھ جلدیں) ہے(ابو عمار ابن عبد الجبار)

روایت بمنزلہ شہادت ہے۔ اگر ابتداء میں ایک صحابی اور بعد میں دو دو راوی آخر تک روایت کرتے جائیں تو ایسی حدیث مقبول ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ اس طرح تو تمام مشہور اور عزیز احادیث کو ماننا پڑے گا تو ایسی روایات کے وجود سے بھی انکار کر دیا۔

۵ روایت بالمعنٰی کے متعلق آپ کا بیان یہ ہے کہ سب روایات روایت بالمعنٰی ہیں اور الفاظ کی تبدیلی سے چونکہ فرق یقینی ہے۔ لہٰذا متون احادیث بھی ظنی ہیں۔

۶ متون کی اسانید۔ یعنی جرح و تعدیل بھی ظنی ہے۔ کیونکہ کسی کے صدق و کذب کا پتہ لگانا باطنی صفات سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے یقین ہو جانا انسان کے بس کی بات بھی نہیں۔ پھر اس جرح و تعدیل میں ذاتی میلانات اور رجحانات کا بھی اثرانداز ہونا ناگزیر ہے۔ لہٰذا صرف احادیث ہی ظنی نہیں بلکہ ان کو جانچنے کے طریقے بھی ظنی اور قیاسی ہیں۔

پھر اس سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جہاں ہر طرف ظن ہی ظن ہو۔ اسے دین کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ لہٰذا اس ذخیرۂ کتب احادیث کو ہم زیادہ سے زیادہ اس دور کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ جس کے رد و قبول میں ہر شخص آزاد ہونا چاہیے۔ گویا ''طلوع اسلام'' کی ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱ ظن دین نہیں ہو سکتا

۲ احادیث کی حیثیت محض تاریخی اور ظنی ہے لہٰذا یہ دین نہیں۔

اب ہم انھی دونوں باتوں پر تبصرہ کریں گے۔

کیا ظن دین ہو سکتا ہے؟:

اگر تو ظن کا معنی شک اور وہم لیا جائے جیسا کہ ''طلوع اسلام'' عوام کو یہی تاثر دیتا چلا آرہا ہے۔تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ظن دین نہیں ہو سکتا۔اگر ظن کا معنی ''مفید علم نظری'' یعنی قرائن سے ''گمان غالب'' یا ''یقین حاصل کرنا'' لیا جائے۔جیسا کہ محدثین نے اس کی وضاحت فرمائی ہے اور قرآنی آیات سے بھی یہی معنی ثابت ہیں تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسا ظن دین یا دین کا حصہ بن سکتا ہے اور ہمارے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہمارے پاس درج ذیل دلائل ہیں:

① قرآن سے استدلال

ا۔شہادت:

شہادت ظنی چیز ہے تاہم قرآن نے اسے قابل اعتماد سمجھ کر اس کا حکم دیا ہے اور یہ بحث پہلے تنقید حدیث میں گزر چکی ہے۔ ⑥

⑥ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو: مصنف کی مفصل کتاب ''آئینۂ پرویزیت'' کے حصہ چہارم کا باب سوم ''تنقید حدیث'' وہاں مصنف رحمہ اللہ نے دو قرآنی آیات کے حوالے دیے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ شَهَٰدَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ حِينَ ٱلْوَصِيَّةِ ٱثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ ﴾ [المائدة=٥:١٠٦]

''اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کو موت آموجود ہو تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ وصیت کے وقت تم (مسلمانوں) میں سے دو مرد عادل (صاحب اعتبار) گواہ بنیں۔''

۲۔ ﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا۟ ذَوَىْ ◄

۲۔ثالثی فیصلہ:

اب میں ایسی آیت کا ذکر کرتا ہوں جس میں شہادت تو دور کی بات ہے کسی بھی اہل عدل کے ذہن پر کلی طور پر انحصار کیا گیا ہے۔مثلاً اگر کوئی حاجی حالت احرام میں شکار کر گزرے تو اس کے کفارہ کے لیے دیئے جانے والے جانور کے تعین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾ (المائدۃ=۵:۹۵)

”تو اس کا بدلہ اس طرح کا چوپایہ ہے جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کردیں اور یہ جانور بطور قربانی کعبہ تک پہنچائی جائے۔“

اب دیکھئے! یہاں جانور کا کفارہ تجویز کرنے کے لیے دو صاحب عدل لوگوں کے

> عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ﴾ [الطّلاق=٦٥:٢]

”پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں اختتام عدت کو پہنچ جائیں تو ان کو یا تو اچھی طرح (زوجیت میں) پاس رکھو یا پھر اچھے طریقے سے علیحدہ کردو اور اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ بنالو۔اور گواہی کو اللہ تعالیٰ کے لیے قائم کرو۔“

بعد ازاں مصنف رحمہ اللہ فرماتے ھیں:” اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب عام مسلمانوں سے ھے۔ جو نبی نہیں ھوتے کہ انھیں وحی یا الھام کے ذریعے گواھوں کی عدالت یا صدق و کذب کا پتہ چل جائے۔ بقول حافظ اسلم صاحب” کسی کے صدق و کذب پر یقینی شہادت ھو ھی نہیں سکتی “ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم کیوں دیا جو عام انسانوں کے بس سے باھر ھے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ھے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ=٢:٢٨٦)

”اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

فیصلہ پر انحصار کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان صاحب عدل لوگوں کی تجویز ایسی ہی یقینی اور قطعی ہو سکتی ہے جیسی کہ ہمارے یہ دوست چاہتے ہیں؟ لیکن اس تجویز کے غیر یقینی اور ظنی ہونے کے باوجود ان کی تجویز اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے اور یہ کام بھی خالص دینی ہے۔ قرآن واقعتاً یقینی سہی لیکن جو احکام یہ بتلاتا ہے وہ اگر غیر یقینی اور ظنی ہوں تو اس کا کیا علاج ہے؟

۳۔ اعمال کے نتائج:

ہم جو کام اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں سر انجام دیتے ہیں۔ ان کے نتائج بھی ظنی ہیں اور یہ ظن بلکہ خطرہ رہتا ہے کہ شاید یہ عمل بارگاہ الٰہی میں قبول ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ (السجدة=۳۲:۶)

''ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیںo''

بات بالکل واضح تھی جسے حافظ اسلم صاحب نے اپنی بات کی پچ میں آکر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان سے اس عدالت کی تحقیق کا صرف اسی حد تک مطالبہ کیا ہے۔ جس حد تک انسان کے بس میں ہے۔ اگرچہ معقولی اور منطقی حضرات کے مطابق اس سے یقین کامل کا درجہ نہ بھی حاصل ہو۔ پھر اسی انسانی تحقیق کے مطابق عمل کرنا عین

اطاعت الٰہی ہوگا اور دین یا اس کا حصہ ہی شمار ہوگا۔

آئمہ رُجال اور مولانا مودودی صاحب:

اس عقل کے میدان میں محترم ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی ''طلوع اسلام'' کا پورا پورا ساتھ دیتے ہیں۔ چنانچہ ''طلوع اسلام'' نے ''مقام حدیث'' میں ان کے بہت سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

① ''محدثین رحمۃ اللہ علیہم کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لیے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتاً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے؟ وہ بہر حال۔ تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرتاً اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہیں۔ ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے ان کے کلام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں، وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔''

② ''محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا۔ جو بلاشبہ بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کون سی ایسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو؟''

③ ''نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک عمل دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکان عقلی نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے۔''

4 ''اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے اسماء الرجال کی جرح وتعدیل کی ہے، وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضروری ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ قرار ٹھہرایا ہے وہ غیر ثقہ ہو؟''

5 ''ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اس حد تک کی ہے جس حد تک وہ کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھاک معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بناء پر اسناد اور جرح وتعدیل کے علم کو کلیتاً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے'' (مقام حدیث۔ صفحہ ۲۲، ۲۳، بحوالہ تفہیمات، حصہ اول، صفحہ: ۳۱۸ تا ۳۲۲)

ان اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

1 ذخیرۂ جرح وتعدیل کو بے کار ثابت کرنے کے لیے جو دلائل ''طلوع اسلام'' دیتا ہے وہی دلائل مولانا مودودی صاحب نے بھی پیش کیے ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ جس انداز میں مولانا نے یہ دلائل پیش کیے ہیں۔ شاید اس انداز میں ''طلوع اسلام'' بھی پیش نہیں کر سکا۔ تو زیادہ مناسب ہوگا۔

④ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ ''طلوع اسلام'' تو ایسے دلائل دینے کے بعد ذخیرۂ اسماء الرجال کو بے کار تسلیم کروانا چاہتا ہے جب کہ موصوف زبانی طور پر محدثین کی خدمات کے معترف بھی ہیں اور اس ذخیرہ کو بہت کار آمد اور عظیم الشان بھی سمجھتے ہیں مگر بالواسطہ وہی کچھ کہہ گئے ہیں جو''طلوع اسلام'' کہنا چاہتا ہے۔

موصوف کے ان اقتباسات کے جوابات تو میں پہلے ''اصول حدیث'' کے باب میں پیش کر چکا ہوں۔ ⑤ تاہم مختصراً درج ذیل ہیں:

1 ان آئمہ کو انسانی کمزوریوں، فطری میلانات اور بشری حدود کا پورا پورا پتہ تھا، اس لیے انھوں نے اس علم کو''ظنی'' قرار دیا۔ جس کا مطلب یہ نہ تھا کہ یہ سب کچھ شک و وہم اور قیاس و تخمین ہے۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ ہم اس تحقیق میں اپنی امکانی کوشش صرف کر چکے ہیں اور یہ کچھ ہماری تحقیق کا ماحصل ہے۔ لہٰذا انھوں نے آیت قرآنی ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة=٢:٢٨٦) کے مطابق تحقیق کی، پھر اپنی اس تحقیق کے مطابق خود بھی عمل کیا اور اسے دوسروں کے لیے واجب الاتباع قرار دیا۔

2 چونکہ انسانی علم کی حدیں محدود ہیں لہٰذا انھوں نے اس بات پر قطعی اصرار نہیں کیا کہ جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں یہ حرف آخر ہے اور یہی ان کا ''ظنی'' کہنے کا مطلب تھا اور تحقیق کے میدان کو آنے والی نسلوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ چنانچہ حافظ ابن

---

⑤ تفصیل کے لیے دیکھیے '' آئینۂ پرویزیت کے حصہ چہارم''دوام حدیث'' کا باب چہارم ''اصول حدیث'' صفحہ نمبر ٥٧٧۔٥٩٥ مطبوعہ از مکتبۃ السلام وسن پورہ لاہور(دسمبر ١٩٩٤ء)

حجر رحمہ اللہ نے صحیحین کی اسانید پر جرح کی۔ جس کو امت نے گوارا کر لیا۔ اگر دوسرا کوئی ماہر فن مزید تحقیق کر کے اس میں کوئی غلطیاں نکالے تو علمائے حق اتنے تنگ ظرف نہیں کہ اس کو خوش آمدید نہ کہیں۔ تحقیق کے بعد جو بات ثابت ہو گی۔ بعد میں وہی بات واجب الاتباع قرار پائے گی اور دین کا حصہ ہو گی کیونکہ یہ بات ﴿ اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ کے ضمن میں آ گئی۔

۳ رہی یہ بات کہ انسانی کمزوریوں اور محدود علم کا سہارا لے کر اس بناء پر انکار کر دیا جائے کہ اس سے قطعی یقین حاصل نہیں ہوتا تو یہ بات دراصل قرآنی آیت: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ کا انکار ہے۔

۲ سنت رسول ﷺ سے استدلال:

فرمان نبوی ہے:

« اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ، وَاِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ، فَاَقْضِیَ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ فَمَنْ قَضَيْتُ بِحَقِّ اَخِيْهِ شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْهُ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ » [۸]

"تم تنازعات لے کر میرے پاس آتے ہو۔ ممکن ہے کوئی تم میں سے دلیل

[۸] (صحيح البخاری= كِتَابُ الْاَحْكَامِ: بَابُ مَوْعِظَةِ الْاِمَامِ لِلْخُصُومِ، الحديث: ۷۱۶۹+ صحيح مسلم= كِتَابُ الْاَقْضِيَةِ: بَابُ الْحُكْمِ بِالظَّاهِرِ وَاللَّحْنِ بِالْحُجَّةِ، الحديث: ۱۷۱۳

پیش کرنے میں ہوشیار ہو اور میں اس کی بات پر فیصلہ کر دوں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کا ناجائز حق نہ لے۔ اگر لیتا ہے تو آگ کا ٹکڑا لیتا ہے۔''

اس حدیث رسول ﷺ سے درج ذیل امور کا پتہ چلتا ہے:

① باوجود اس بات کے کہ گواہوں کے بیانات میں کذب بیانی کا امکان ہوتا ہے۔ عدالت انھی بیانات کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔

② قاضی خواہ کتنی ہی دیانت داری سے فیصلہ کرے، اور درست فیصلہ کرے لیکن چونکہ بنیاد (گواہوں کے بیانات) میں کذب بیانی کا امکان ہے لہٰذا اس فیصلہ کے صدور میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔

③ اس غلطی کے امکان کے باوجود اور اس بات کے باوجود کہ ایک شخص عدالت کے روبرو حرام طریقہ سے دوسرے شخص کا حق حاصل کر سکتا ہے۔ وہ فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔ اور یہ سارا ''عملِ قضاء'' اطاعت الٰہی کے تحت آتا ہے۔ لہٰذا یہ عین دین ہے اور ناجائز حق وصول کرنے والے کو اخروی زندگی میں اس کی سزا مل کے رہے گی اور یہ بھی دین ہے۔

اب بتلایئے! اس بارے میں آپ کی عقل کیا رہنمائی کرتی؟ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ میں غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔ لیکن عالم الغیب تو وہ بھی نہ تھے۔ پھر دوسرے قضاۃ (منصفوں اور ججوں) کے علم کی محدودیت کے علاوہ بشری کمزوریاں بھی لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ تو کیا ایسی اسلامی عدالتیں جو قانون الٰہی کے تحت فیصلے کرتی ہیں وہ دین ہے یا نہیں؟ کیا کبھی کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ عدالتی فیصلوں

میں ظن کا امکان غالب رہتا ہے اس لیے عدالتوں کو فیصلے کرنا ترک کر دینا چاہیے؟

۳ دینی معمولات سے استدلال:

فرض کیجیے کہ آپ نماز بھول جاتے ہیں اور آپ کو یقین نہیں کہ میں اس وقت تک تین رکعت ادا کر چکا ہوں یا چار۔ اب اس صورت میں آپ کا ظن غالب ضرور رہنمائی کرے گا۔ یعنی اس شک میں بھی ایک کمزور پہلو ضرور ہوگا اور دوسرا غالب ہوگا۔ اب اطاعت الٰہی یہ ہے کہ آپ اپنے گمان غالب کے مطابق عمل کریں اور بھولنے کے عوض نماز کے آخر میں سجدہ سہوادا کریں۔ یہ عین دین ہے۔ حالانکہ اس کی بنیاد یقین پر نہ رہی تھی اور ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ حدیث ہے:

((دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ)) [۹]

''اس چیز کو چھوڑ دو جو کھٹک کا باعث ہے اور اس کو اختیار کرو جس میں کھٹک نہیں۔''

اگر آپ اس بات کو سمجھ جائیں گے تو بہت سی خلش پیدا کرنے والی باتوں کا آپ کو'' آپ سے آپ'' جواب مل جائے گا۔ بس مقصد اطاعت الٰہی اور نیت خالص ہونی چاہیے۔ پھر اگر اجتہاد میں یا یاداشت میں کوئی غلطی ہو بھی جائے تو اس سے آپ کے

---

[۹] صحیح التِّرمذی= أَبوَابُ صِفَةِ القِيَامَةِ : بابٌ مِنه (رقمُ الباب: ۲۲، الحدیث: ۲۰۴۵) + صحیح النِّسائی= كِتَابُ الأشربة: بابُ الحَثِّ عَلٰى تَرکِ الشُّبُهَاتِ، الحدیث: ۵۲٦۹ + سُنَنُ الدَّارِمِیُّ= کتاب البُیُوع : باب دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ ، الحدیث: ۲۵۳۵+ مسند احمد: ۲۰۰/۱+ إرواء الغليل، الحدیث: ۱۲، ۲۰۷٤، اس حدیث کو امام ابن حبان ، امام بیهقی، امام حاکم اور امام طبرانی(رحمہم اللہ) نے بھی روایت کیا ھے۔

دین یا اطاعت الٰہی میں چنداں فرق نہیں پڑے گا۔ اگر چہ اس کی بنیاد یقین پر نہیں۔

﴿۴﴾ ''طلوع اسلام'' کے نظریہ سے استدلال:

ادارہ مذکور کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن میں جو قوانین مذکور ہیں صرف وہ غیر متبدل ہیں۔ باقی قوانین زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق ''مرکز ملت'' وضع کرے گا اور اس طرح شریعت اسلامی مکمل ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''مرکز ملت'' جو قوانین بنائے گا ان کی بنیاد یقین پر ہوگی؟ کیا اس ادارہ کے انسان بشری کمزوریوں، علم کی محدودیت اور ذاتی رجحانات سے مبرا ہوں گے؟ آخر وہ کون سی خامی ہے جو آئمہ رجال یا محدثین میں تو موجود ہے مگر ان میں وہ موجود نہ ہوگی؟ پھر کیا ظن و تخمین پر بننے والے یہ قوانین دین کا حصہ ہوں گے؟ اگر ہوں گے تو کیسے؟ جب کہ یقین پر مبنی کوئی بات نہیں اور یقینی چیز تو صرف قرآن ہے۔

﴿۵﴾ عام معمولات سے استدلال:

اس دنیا میں تمام امور خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی ظن کے سہارے پر ہی چل رہے ہیں اور چل سکتے ہیں۔ دنیا امید پر قائم ہے، یقین کہیں بھی نہیں ہوتا۔

- تاجر یا کاروباری حضرات کو ایسا یقین نہیں ہوتا کہ جو سودا یا کاروبار وہ کر رہے ہیں اس میں یقیناً نفع ہوگا۔ بس امید ہی ہوتی ہے۔
- بادشاہ لشکر کشی کرتے ہیں تو انھیں بھی فتح کی امید ہی ہوتی ہے۔ جب کہ معاملہ دگر گوں بھی ہوسکتا ہے۔
- کسان کھیتی باڑی کرتا ہے تو وہ بھی امید کی بناء پر کرتا ہے۔

غرضیکہ اس کائنات کا تمام کاروبار امید یا گمان غالب کے سہارے چل رہا ہے اور اسی گمان غالب کو محدثین ''ظن'' کہتے ہیں۔ جس سے انسان کے لیے اس دنیا میں مفر کی کوئی صورت نہیں۔ خواہ معاملہ دینی ہو یا دنیوی۔



دوسرا اعتراض

تاریخ اور حدیث کا فرق

ادارہ "طلوع اسلام" کی طرف سے اکثر و بیشتر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ذخیرۂ احادیث کی حیثیت محض تاریخ کی سی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو "دینی تاریخ" کہا جاسکتا ہے لیکن یہ دین نہیں ہوسکتا۔ اس پر دلیل بھی دی جاتی ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب (جو آج کل صحیح البخاری کے نام سے موسوم ہے) کا نام رکھا تھا"

" اَلْجَامِعُ الصَّحِیْحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ اُمُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ وَسُنَنِهٖ وَاَیَّامِهٖ "

صحیح البخاری کے پورے نام کی وضاحت:

لطف کی بات یہ ہے کہ اس نام میں امور اور ایام کے الفاظ پر خاصا زور دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان الفاظ سے تاریخ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے الفاظ جو حدیث کو تاریخ سے بلند تر مرتبہ پر فائز کرتے ہیں۔ ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس نام پر غور کرنے سے تاریخ اور حدیث کا فرق بہت حد تک واضح ہو جاتا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

(۱) اَلْجَامِع:

محدثین کی اصطلاح میں "الجَامِعُ" کا لفظ اس مجموعہ حدیث کے لیے بولا جاتا

ہے کہ جو زندگی کے جملہ پہلوؤں کو محیط ہو۔ تاریخ کا میدان یہ ہے کہ مؤرخ کسی بادشاہ یا علاقہ کے سیاسی حالات کو قلمبند کرے پھر اس میں ضمناً کچھ نہ کچھ معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ لیکن "الجامع" کا میدان اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ وہ عقائد واعمال، اخلاق و عادات، معیشت و معاشرت، اکتساب و معاملات حتی کہ مَا بَعْدَ الطَّبِيْعَاتِ تک کے مسائل مثلاً حشر ونشر، مکافات عمل اور جنت و دوزخ تک سب کو محیط ہے۔

(۲) اَلصَّحِيْح:

یہ کتاب "الصَّحِیح" بھی ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہے جس کے تمام راوی ثقہ یعنی عادل و ضابط ہوں۔ پھر ان تمام راویوں میں اتصال ہو اور وہ حدیث کسی دوسری صحیح حدیث سے متصادم بھی نہ ہو۔

اب دنیا بھر کی کوئی تاریخ کی کتاب اٹھا کر دیکھئے۔ ان کے مؤرخین نے لکھتے وقت ایسی کسی ایک شرط کی بھی پابندی کی ہے؟ ایک عام تاریخی تصنیف کے متعلق ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مؤرخ کا بیان ہے کہ:

"کسی زمانہ کے حالات جب قلمبند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتیں ہیں۔ جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑے زمانہ بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد) یہی مجموعہ ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتی ہے۔ یورپ کی اکثر تصانیف اسی طرز پر لکھی گئی ہیں"

اب اگر اس طرح لکھی ہوئی تاریخ کی ہم آہنگی میں کوئی قلمی نوشتہ بھی مل جائے تو

پھر تو اس تاریخ کے مستند ہونے کے کیا کہنے۔ یہ قلمی نسخہ جتنا زیادہ پرانا اور دیمک خوردہ ہوگا، اسی نسبت سے وہ ایک قیمتی دستاویز قرار پائے گا۔ حالانکہ اس کا راوی مجہول الحال (جس کے حالات زندگی ہی کس کو معلوم نہیں) اور نہ معلوم کس قسم کے کردار کا مالک ہوتا ہے۔ آج کل تو لوگوں نے ایسی قیمتی دستاویزات کے حصول کے لیے کئی مصنوعی طریقے بھی دریافت کر لیے ہیں۔

پھر اگر کہیں سے پتھر یا دھات پر کوئی تحریر زمین میں دفن شدہ مل جائے۔ تو اس کی وقعت وحی الٰہی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ گویا اس کا تحریر کنندہ ہر طرح کے عیوب اور غلطیوں سے پاک صاف تھا۔ تاہم چونکہ ایسے کتبوں کی آج کل وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا ایسی تحریریں بھی خود ہی اس وقت کے رسم الخط میں لکھ کر کسی دور افتادہ مقام پر گاڑھ دی جاتی ہیں اور کچھ مدت بعد نکال کر انھیں دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔

تاریخ کے میدان میں جو چیز فی الواقع کچھ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود نوشتہ سوانح حیات (autobigraphy) ہو۔ لیکن اس میں بھی انسانی عواطف، جانبداری اور "ملا در مدح خود می گوید" ⑩ کے فطری رجحانات سے کون انکار کر سکتا ہے؟ بس یہ ہے تاریخ کی کل کائنات۔ جس کی تصنیف و تدوین کے لیے تمام حکومتیں اپنے وسیع ذرائع استعمال کرتی اور کروڑہا روپے خرچ کر رہی ہیں۔ اب اس کے مقابلہ میں حدیث کی تصنیف پر نظر ڈالیے، جس کے اولین راوی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاک باز جماعت ہے۔

⑩ "یہ فارسی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ جس کا معنی ہے کہ "ملاں اپنی تعریف آپ ہی کر رہا ہے"

جن میں دوسرے راویوں کے علاوہ کچھ زائد خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، جو یہ ہیں:

① یہ اولین راوی واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ جو کچھ روایت کرتے ہیں خود آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر روایت کرتے ہیں۔ ⑪

---

⑪ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی بھی رونما ہونے والے واقعہ کے سب سے پہلے عینی شاهد(Eye witnes) تھے۔ وہ جو کچھ روایت کرتے تھے اس کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا اور کانوں سے سنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتب احادیث میں جا بجا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احادیث کو روایت کرتے ہوئے۔ "رَأَیۡتُ" یا " سَمِعۡتُ" کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ " رَأَیۡتُ" کا معنی ہے کہ میں نے دیکھا اور "سَمِعۡتُ" کا معنی ہے کہ میں نے سنا۔ دونوں کی چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

① سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اپنے ساتھیوں کو صحیح عقیدہ سمجھانے کے لیے حجر اسود سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

((إِنَّمَا اَنۡتَ حَجَرٌ لَا تَضُرُّ وَ لَا تَنۡفَعُ وَ لَو لَا أَنِّیۡ رَأَیۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ سَلَّمَ قَبَّلَكَ مَا قَبَّلۡتُكَ ، ثُمَّ قَبَّلَهُ))

(اے حجر اسود!) تو محض ایک پتھر ہے۔ تو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ۔اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تیرا بوسہ نہ لیتا،یہ بات ارشاد فرمانے کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حجرا سود کا بوسہ لیا۔"(مؤطا امام مالك= کتاب الحج: باب تقبیل الرکن الأسود فی الاستلام + صحیح ابن خزیمة)

② ایک قریشی بزرگ جناب اسماعیل بن عبد الرحمن رحمہ اللہ فرماتے ہیں : میں سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا "مقامِ حمی"تك کے سفر میں ساتھی بنا۔ جب آفتاب غروب ہو گیا تو میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو یہ ←

② وہ اس بات کے پابند اور مامور ہیں کہ جس ہستی کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ اس

کہنے میں ڈر محسوس کیا کہ انھیں عرض کروں کہ نماز مغرب کا وقت ہو چکا ہے۔ غروب آفتاب کے بعد بھی وہ مسلسل محوِ سفر رہے۔ یہاں تک کہ آسمان کے کنارے کی سفیدی جاتی رہی اور نماز عشاء کی سیاھی چھا گئی۔ یعنی نماز عشاء کا وقت ہو گیا۔ تب وہ اپنی سواری سے اترے اور مغرب کی تین رکعات پڑھیں۔اس کے بعد(نماز عشاء کی) دو رکعتیں پڑھیں۔ا س کے بعد اپنے ساتھ سفر کرنے والے قریشی بزرگ جناب اسماعیل بن عبد الرحمن رحمہ اللہ سے فرمانے لگے:

((هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَفْعَلُ))

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح (مغرب و عشاء کو جمع) کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" (نسائی= كتابُ المَوَاقِيت: باب الوقت الّذى يَجمَعُ فيه المُسَافِرُ بَيْنَ المَغرِبِ وَالعِشَاءِ : ٥٩٢)

③ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ھیں :

((خَصْلَتَانِ سَمِعْتُهُمَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ۔ فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوْا الْقِتلَةَ وَ إِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوْا الذَّبحَ وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ))

"میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کی عادتوں کے متعلق سنا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللّٰہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے احسان اور خوش اسلوبی کا معاملہ کرنا فرض کیا ہے۔ لھٰذا جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھی طرح قتل کیا کرو۔(یعنی قصاص میں خون کا بدلہ لینا پڑے تو مقتول کو جلدی فارغ کر دیا کرو اس کو تڑپا تڑپا کر قتل نہ کیا کرو۔) اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرنے کا ارادہ کرو تو اس کو بھی بہتر طریقہ سے ذبح کیا کرو، اپنی چھری تیز کر لیا کرو اور جانور کو ذبح کرتے وقت راحت پہنچانے کا اھتمام کیا کرو۔"

کی ایک ایک نقل و حرکت اور ادا کو بغور ملاحظہ کریں۔ پھر اپنے آپ میں وہی خصوصیات پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں اور حتی المقدور اپنے آپ کو انھیں کے رنگ میں رنگ لیں۔ ⑫

> (ابو دَاوٗد = كِتَابُ الضَحايا: باب فى النَّهى أَن تُصبَرَ البَهَائِمُ وَالرِّفُقِ بالذبيحة، : ۲۸۱٤)

④ ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا قرض لیا کرتی تھیں۔ ان کے بعض گھر والوں نے انہیں اس کام سے منع کیا کہ آپ لوگوں سے قرض نہ لیا کریں۔ گویا ان کے گھر والوں نے سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے قرض لینے کے معاملہ کو برا جانا۔ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ھیں:-

« بَلٰی إِنِّیُ سَمِعُتُ نَبِیِّ وَ خَلِیُلِیُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَ سَلَّمَ یَقُوُلُ : « مَا مِنُ مُسُلِمٍ یَدَّانُ دَیُنًا یَعُلَمُ اللّٰهُ مِنُهُ أَنَّهٗ یُرِیُدُ أَدَاءَهٗ إِلَّا أَدَّاهُ اللّٰهُ عَنُهُ فِی الدُّنُیَا »

" جی ھاں! میں نے اپنے نبی اور دلی دوست جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ھوئے سنا ھے: کوئی مسلمان جب کسی سے قرض لے۔ اللّٰہ تعالیٰ جانتا ھو کہ اس کا ارادہ واقعتا اسے لوٹانے کا ھے ۔ تو اللّٰہ تعالیٰ دنیا ھی میں اس کی طرف سے ضرور ادا کرا دے گا۔" (ابن ماجة= كِتَاب الصَّدقَات: بابُ مَنِ ادَّانَ دَیُنًا وَ هُوَ یَنوِی قضَاءَهٗ ، : ۲٤۰۸)

مذکورہ بالا چار مثالوں میں سے پھلی دو کا تعلق آنکھوں سے دیکھنے کے ساتھ ھے۔ جب کہ آخری دو کا تعلق کانوں سے سننے کے ساتھ ھے۔ (ابو عمار)

⑫ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بغور دیکھنے کے بعد اس بات کے واقعتا پابند تھے کہ اس کو اپنی عملی زندگی(Precticle life) میں لاگو بھی کریں۔ تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیں۔ قرآن مجید میں اللّٰہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ھیں:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ

﴿٣﴾ وہ اس بات کے بھی پابند اور مامور ہیں کہ آپ کی اس سیرت طیبہ کو ان لوگوں تک

ذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیْرًا ۝ ﴾ (الأحزاب=٣٣:٢١)

''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور آخرت کے دن کی توقع رکھتا ہے۔ اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۝''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴾ (الحشر=٥٩:٧)

''تمھیں جو کچھ رسول (ﷺ) دے وہ لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۝''

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تسلیم و رضا کے پیکر بن کر دکھا دیا۔ جو مزاج رسول میں آتا وہ اس پر اپنا سر تسلیم خم کر دیتے۔ اس کی صرف دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

① خالد بن اسید کے خاندان کے ایک فرد نے سیدنا ابو عبد الرحمن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا:

((یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنَّا نَجِدُ صَلٰوۃَ الْخَوْفِ وَ صَلٰوۃَ الْحَضَرِ فِی الْقُرْآنِ وَ لَا نَجِدُ صَلٰوۃَ السَّفَرِ ۔ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: یَاابْنَ أَخِیْ! إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی بَعَثَ اِلَیْنَا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ لَا نَعْلَمُ شَیْئًا فَإِنَّمَا نَفْعَلُ کَمَا رَاَیْنَاهُ یَفْعَلُ))

''اے ابو عبدالرحمن! بلا شک و شبہ ہم حالت جنگ کی نماز (صلوٰۃ خوف) اور حالت اقامت کی نماز کا بیان تو قرآن میں پاتے ہیں۔ مگر نماز سفر کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اے میرے بھتیجے! بے شک اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف محمد ﷺ کو نبی بنا کر مبعوث کیا تھا، جب کہ ہم دین اور شریعت کے بارے کچھ نہیں جانتے تھے۔ (لہٰذا ہمارے لیے متبع و مقتدی شخصیت جناب محمد ﷺ ہیں۔) ≺

پہنچائیں جو غیر حاضر ہیں یا بعد میں آنے والے ہیں۔ ⑬

➤ جیسے جیسے ہم نے انھیں کوئی عمل سرانجام دیتے دیکھا ہے ویسے ویسے ہم عمل کرتے رہے۔ (جن میں سے ایک نماز سفر بھی ہے۔ اگرچہ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں ہے مگر ہم اس کو اس لیے پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے حالت سفر میں یہ نماز ثابت ہے۔)(مؤطا امام مالك= كتاب قَصرِ الصَّلٰوة فِي السَّفَرِ)

⑫ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص حالت نماز میں باآواز بلند یہ کلمات کہنے لگا:

((اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَ أَصِيْلًا))

"اللہ سب سے بڑا ہے ، بہت زیادہ تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ صبح و شام ہم ان باتوں کا اعتراف و اقرار کرتے ہیں۔" نماز سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پوچھا : یہ کلمات کہنے والا شخص کون ہے؟قوم کا وہ فرد بول پڑا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں نے یہ کلمات ادا کیے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((عَجِبتُ لَهَا وَ ذَكَرَ كَلِمَةً مَعْنَاهَا فُتِحَتْ لَهَا اَبْوَابُ السَّمَآءِ ، قَالَ ابْنُ عُمَرَ : مَا تَرَكْتُهُ مُنْذُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُهُ))

"مجھے ان کلمات کی بنا پر بڑا تعجب ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا جس کا مطلب کچھ یوں تھا:" ان کلمات کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے۔" سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں : جب سے میں نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سنا ہے تب سے میں نے یہ کلمات کبھی نہیں ترک کیے۔"

(نسائی= کتاب الإفتِتَاح: باب القَولُ الَّذِی یُفتَتَحُ به بالصَّلٰوة ، :۸۸۷)(ابو عمار)

⑬ سیرت طیبہ کے اعتقادی ، عملی، معاشرتی، معاشی، سیاسی ، عائلی ، ثقافتی، اندرونی، بیرونی الغرض تمام پہلوؤں کو بعد میں آنے والی امت ➤

④ انھیں یہ حکم بھی دیا گیا تھا جس ہستی کے وہ مؤرخ بننے والے ہیں۔ اس کو اپنی جان

➢ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے افراد تک پہنچانے کی ذمہ داری نبھانے کا رسول اللہ ﷺ نے انھیں حکم بھی دیا تھا اور یہ ذمہ داری نبھانے والے کے لیے دعائیہ کلمات بھی ارشاد فرمائے تھے۔ صرف دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

① مشہور تابعی جناب ابو شریح رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے (یزید بن معاویہ کی طرف سے متعین کردہ گورنر مدینہ) عمرو بن سعید سے اس وقت کہا، جب وہ مکہ مکرمہ کی طرف (سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے) فوجیں بھیج رہے تھے:

"امیر محترم! مجھے آپ اجازت دیں تو میں وہ حدیث آپ کے سامنے بیان کروں جو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے روز ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کو میرے دونوں کانوں نے سنا، میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے اور جب رسول اکرم ﷺ یہ حدیث بیان فرما رہے تھے تو میری دونوں آنکھیں آپ کو دیکھ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے (سب سے پہلے) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر ارشاد فرمایا: "مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے حرم قرار دیا ہے۔ انسانوں نے مکہ کو حرم قرار نہیں دیا۔ لہٰذا (سن لو!) کسی شخص کے لیے جائز نہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ وہ مکہ میں کسی کا خون بہائے یا کسی درخت کو کاٹے۔ اگر کوئی شخص مکہ میں خون بہانے کا اس بات سے جواز نکالے کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ نے بھی تو (فتح مکہ کے روز) جنگ کی تو اس کو کہہ دینا: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اجازت عطا کی تھی، تمھارے لیے اجازت نہیں دی اور مجھے بھی دن کے کچھ لمحوں کے لیے اجازت ملی تھی۔ آج اس کی حرمت ویسی ہی لوٹ آئی ہے جیسی کل تھی۔ جو افراد یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک میرا یہ پیغام اور میری دعوت پہنچا دیں جو آج یہاں اس میدان میں نہیں ہیں۔ (صحیح بخاری= کتاب العلم: باب لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ : ۱۰۴+ صحیح مسلم= کتاب الحج: باب تحریم مکة و صَيْدِهَا وَ خَلَاهَا وَ شَجَرِهَا وَ لُقَطَتِهَا : ۱۳۵۴) ➢

سے بھی عزیز سمجھیں۔ اس حکم نے جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جانثاری کی کیفیت پیدا کردی تھی وہاں آپ کے ساتھ دلی لگاؤ اور قلبی محبت بھی پیدا کردی تھی۔ اس بات کا جو اثر حافظہ پر قائم ہوگا وہ ہر عام و خاص کو معلوم ہے۔ ⑭

➢ ② مشہور تابعی ابان بن عثمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" ایک دفعہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مروان بن حکم کے پاس سے نکلے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہم نے کہا کہ مروان نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو کسی اہم بات کے لیے اپنے ہاں بلایا ہو گا۔ لہٰذا ہم ان کی طرف چل دیے اور ان سے سوال کیا کہ کس مقصد کے لیے مروان نے آپ کو بلایا تھا۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ہم سے ایسی باتوں کے بارے سوال کیا تھا جو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سماعت کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ حدیث تھی۔(جو میں نے ابھی انہیں سنائی ہے) یہ حدیث رسول ﷺ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ آپ ﷺ یہ دعا فرما رہے تھے:

((نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ غَيْرَهُ ۔ فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ ۔ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيهٍ))

"اللّٰہ تعالیٰ ترو تازہ اور سر سبز وشاداب رکھے اس شخص کو جو ہم سے حدیث سنتا ہے۔ پھر اس کو یاد کر لیتا ہے۔ پھر اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جس تک وہ حدیث نہ پہنچی ہو۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس فقہ اسلامی(یعنی حدیثِ رسول ﷺ) کا علم ہوتا ہے لیکن جسے وہ آگے بیان کرتے ہیں وہ بیان کرنے والے سے زیادہ فقیہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس حدیث رسول ﷺ کا علم تو ہوتا ہے مگر وہ فقیہ (محدث) نہیں ہوتے۔"

(ترمذی = کتاب العلم: باب فی الحثِّ علٰی تبلیغ السّماع : ۲٦٥٦ ابن ماجة = کتاب السُّنَّة: باب من بلَّغ عِلْمًا : ۲۳۰) (ابوعمار)

⑭ یہ بات روز روشن کی طرح ایک اٹل اور بے بدل حقیقت ہے کہ صحابہ ➢

۵ پھر ساتھ ہی ان صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ تلوار بھی لٹک رہی تھی کہ جس نے مجھ پر

کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کو دنیا اور دنیا کے تمام رشتوں اور ناتوں سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ کوئی عزیز سے عزیز رشتہ بھی رسول اکرم ﷺ سے بڑھ کر انھیں عزیز نہ تھا۔ ایسا ھوتا بھی کیوں؟ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ھیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَ وَلَدِهِ وَ النَّاسِ أَجْمَعِيْنَ))

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہ ہوگا جب تک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس کے دل میں میری محبت نہ ہو جائے۔''

(صحيح البخارى= كتاب الإيمان: باب حُبُّ الرَّسُوْلِ مِنَ الإيمان: ۱۵+ صحيح مسلم=كتاب الإيمان : بابُ وُجُوبِ مَحَبَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَكْثر مِنَ الْأَهْلِ وَالْوَلَدِ وَالْوَالِدِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ...... الخ : ٤٤)

سیدنا عبد اللہ بن ھشام رضی اللہ عنہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق ایك واقعہ یوں بیان فرماتے ھیں :

« كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَ هُوَ آخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! لَأَنْتَ اَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِيْ۔ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَه: « لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ » فَقَالَ لَهُ عُمَرُ : فَإِنَّهُ الْآنَ وَاللّٰهِ لَأَنْتَ اَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ۔ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ « الْآنَ يَاعُمَرُ ! »

''ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ جا رہے تھے اور آپ ﷺ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا! یا رسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے عزیز ہیں، سوائے میری اپنی جان کے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ (آپ کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا) جب تک میں تمھیں تمھاری اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کی قسم! پھر

< اب آپ مجھے میری اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:ہاں! عمر! اب تیرا ایمان مکمل ہوا ہے۔"

(صحیح البخاری= کتاب الأیمانِ وَالنُّذُور: باب کَیفَ کَانَتْ یَمِینُ النَّبِیِّ ﷺ : ٦٦٣٢)

یہ بات محض زبانی کلامی اور نظریاتی(Idologicly)هی نہ تھی بلکہ عملی (Practicaly) لحاظ سے بھی حقیقت پر مبنی تھی۔اس ضمن میں غزوۂ احد کا نقشہ ذرا اپنی نگاهوں کے سامنے لائیں جب اسلامی لشکر کا ایك بهت بڑا حصہ رسول اللّٰہ ﷺ سے جدا هو جاتا هے۔ اسلامی لشکر کا دوسرا حصہ دشمن پر فدایانہ حملے شروع کردیتا هے ۔ جب کہ اسلامی لشکر کا تیسرا گروہ وہ تھا جسے اپنی جانوں کی قطعاً پروا نهیں تھی انهیں صرف اور صرف رسول اکرم ﷺ کی فکر دامن گیر تھی۔ رسول اللّٰہ ﷺ کے ارد گرد کافروں کے گھیراؤ اور محاصرہ کا علم هوتے هی یہ گروہ رسول اللّٰہ ﷺ کی طرف پلٹا۔ ان میں سرفهرست سیدنا ابوبکر صدیق،سیدنا عمر بن خطاب اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم تھے۔ یہ لوگ کافروں پر تابڑ توڑ حملے کرنے میں بھی پیش پیش تھے۔ مگر جب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے لیے انتهائی خطرناك صورت حال پیدا هو گئی تو آپ ﷺ کی حفاظت اور دفاع کرنے والوں میں بھی سب سے آگے آگئے۔ عین اس وقت جب اسلامی لشکر نرغے میں آکر مشرکین کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رها تھا رسول اللّٰہ ﷺ کے آس پاس خونریز معرکہ آرائی جاری تھی۔ ایك ایسا نازك مرحلہ بھی آیا کہ مشرکین کے محاصرہ(crec down) کے وقت رسول اکرم ﷺ کے همرکاب صرف نو افراد باقی رہ گئے تھے۔ اس وقت رسول اللّٰہ ﷺ نے مسلمانوں کو پکارا۔ میرے ساتھیو! میری طرف آؤ۔ میں اللّٰہ کا رسول هوں۔ تو آپ کی آواز مسلمانوں سے پهلے مشرکین نے سن لی اور آپ کو پهچان لیا۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی بہ نسبت مشرکین رسول اللّٰہ ﷺ کے زیادہ قریب تھے۔ >

➢ چنانچه مشرکین نے جھپٹ کر آپ پر حمله کر دیا اور کسی مسلمان کے پهنچنے سے پهلے اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی۔ اس فوری حملے کے نتیجه میں مشرکین اور وهاں موجود ۹جانثار صحابه کے درمیان نهایت سخت معرکه آرائی شروع هو گئی۔ ان ۹ صحابه میں سے سات انصاری تھے اور دو مهاجر۔ اس سخت معرکه آرائی میں۹ صحابه کرام رضی اللہ عنہم نے جو داد شجاعت دی۔محبت رسول اور جاں‌نثاری کے جو نادر نمونے پیش کیے، جانبازی کے جو جوهر دکھائے وه جریدۂ عالم پر آج بھی انمٹ نقوش بن کر ثبت هیں ۔دشمن آپ کو چند صحابه یعنی سات انصاریوں اور دو قریشیوں کے ساتھ تنها پا کر سر چڑھ جاتے هیں۔ ان جذبات انگیز لمحات کو سیدنا انس رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے هیں که رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت فدائی کارروائی پر برانگیخته کرتے هوئے یوں ارشاد فرماتے هیں:

« مَنْ يَّرُدُّهُمْ عَنَّا وَ لَهُ الْجَنَّةِ(أَوْ هُوَ رَفِيْقِيْ فِي الْجَنَّةِ) فَتَقَدَّمَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ۔ ثُمَّ رَهِقُوْهُ اَيْضًا فَقَالَ مَنْ يَّرُدُّهُمْ عَنَّا وَ لَهُ الْجَنَّةُ (أو هُوَ رَفِيْقِيْ فِي الْجَنَّةِ) فَتَقَدَّمَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ۔ فَلَمْ يَزَلْ كَذٰلِكَ حَتّٰى قُتِلَ السَّبْعَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِصَاحِبَيْهِ:« مَا أَنْصَفْنَا أَصْحَابَنَا »

”دشمنوں کو ہم سے کون دور ہٹائے گا؟ جو ہٹائے گا اس کے لیے جنت ہوگی۔(یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔) یہ سن کر ایک انصاری آگے بڑھ کر دشمنوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے۔ دوبارہ دشمن سر پر چڑھ آتے ہیں تو دوبارہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح خوشخبری سناتے ہیں: کون ہے جو ان کو ہم سے دور ہٹائے؟ اس کے لیے جنت ہے(یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا) پھر ایک انصاری صحابی آگے بڑھتا ہے اور قتال کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساتوں انصاری صحابہ جنت کے حصول کی خوشخبری پر جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں قریشی ساتھیوں کو مخاطب ➢

کرتے ہوئے ان کو ان کی غیر ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ہم نے اپنے انصاری ساتھیوں کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ (کہ وہ تو جنت کی بشارت پر ہمارے دفاع کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر گئے اور ہم پیچھے رہ گئے۔)

(صحیح مسلم= کتاب الجهاد: باب غزوة أحد : ۱۷۸۹۔)

ان ساتوں فدائی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے آخری انصاری صحابی سیدنا عمارہ بن یزید بن السکن رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ لڑتے رہے، لڑتے رہے، یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔ لڑتے لڑتے ان کے گرنے اور شہید ہونے کا منظر بھی بڑا دلفریب اور دلکش ہے۔ جب سیدنا عمارہ بن یزید رضی اللہ عنہ زخموں سے چور ہو کر گرے ہوئے تھے۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت وہاں آن پہنچی۔ انھوں نے کفار کو سیدنا عمارہ سے پیچھے دھکیلا اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے پاؤں پر ٹیک لیا اور انھوں نے اس حالت میں دم توڑ دیا کہ ان کا رخسار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک پر تھا۔(ابن ھشام: ۲/ ۸۱) بعض اپنی آرزو کا یوں اظہار کرتے ھیں:

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

مگر سیدنا عمارہ بن یزید بن السکن رضی اللہ عنہ کی یھی آرزو اور دل کی حسرت تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یوں حقیقت بن گئی کہ :

نکل جائے دم تیرے قدموں کے "اوپر"
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

ساتوں انصاری صحابہ میں سے آخری فدائی صحابی سیدنا عمارہ بن یزید کے گرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ھمراہ صرف دونوں قریشی صحابی رہ گئے تھے۔ ایک سیدنا طلحہ بن عبید اللہ اور دوسرے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما یہ لمحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے لیے نہایت ھی نازک ترین لمحہ تھا۔ ادھر مشرکین مکہ کے لیے یہ لمحہ سنہری موقعہ تھا۔ مشرکین

نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کوتاھی نہیں برتی۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور چاھا کہ آج رسول اللہ ﷺ کا کام تمام کر کے ھی دم لیں گے ۔ ایك کافر عتبہ بن ابی وقاص نے آپ کو پتھر مارا جس سے آپ پھلو کے بل گر گئے اور آپ کا داھنا نچلا رباعی دانت ٹوٹ گیا اور آپ کا نچلا ھونٹ مبارك زخمی ھو گیا۔ دوسرے ایك کافر عبد اللہ بن شھاب زھری نے آگے بڑھ کر آپ کی مبارك پیشانی زخمی کر ڈالی۔ ایك اور اڑیل اور ضدی کافر سوار عبد اللہ بن قمۂ آپ کے کندھے پر ایسی سخت تلوار ماری کہ آپ ایك مھینا سے زیادہ اس کی تکلیف محسوس کرتے رھے۔ اس کے بعد عبد اللہ بن قمئہ کافر نے اسی طرح کا ایك بھر پور اور زور دار تلوار کا وار کیا جو آنکھ کے نیچے کی ابھری ھوئی ھڈی پر لگا اور اس کی وجہ سے خود (زرہ) کی دو کڑیاں چھرے کے اندر دھنس گئیں۔

اس میں کوئی شك نھیں کہ اس روز کافر رسول اکرم ﷺ کا کام تمام کرنا چاھتے تھے لیکن: ؎

مجھ کو تو بچا لیا میرے پروردگار نے

دونوں قریشی صحابیوں سیدنا سعدبن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہما نے جانبازی اور بے مثل بھادری سے کام لیتے ھوئے صرف دو ھونے کے باوجود مشرکین کی کامیابی نا ممکن بنا دی۔ یہ دونوں عرب کے ماھر ترین تیر انداز تھے۔ انھوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مسلسل تیر پھینك پھینك کر حملہ آوروں کو رسول اللہ ﷺ سے دور ھٹائے رکھا۔

جھاں تك سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تعلق ھے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ترکش کے سارے تیر ان کے لیے بکھیر دیے اور فرمایا: ((اِرْمِ! فِدَاكَ اَبِیْ وَ اُمِّیْ)) "سعد! تیر چلاؤ! آپ پر میرے ماں باپ فدا ھوں۔" ان کی صلاحیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ھے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ھیں: رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی اور کے لیے ماں باپ کے فدا ھونے کی بات

➢ نہیں کھی۔

جہاں تك سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کا تعلق ھے ان کے کارنامے کا اندازہ سنن نسائی(۲/۵۲،۵۳) کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ھے۔ جس میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ھیں کہ جب ساتوں انصاری صحابہ شھید ھو گئے تو سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انھوں نے تنھا گیارہ آدمیوں کے برابر لڑائی کی۔ ان کے ھاتھ پرتلوار کی ایك ایسی ضرب لگی جس سے ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔ اس پر ان کے منہ سے آواز نکلی"حس"۔ (جیسے ھمارے ھاں تکلیف کے عالم میں منہ سے بے اختیار "سی" نکل آتا ھے) رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم "حس " کی جگہ " بسم اللّٰہ" کھتے تو تمھیں اللّٰہ کے فرشتے اوپر اٹھا لیتے اور لوگ دیکھتے۔ ابو داؤد طیالسی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ھے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ جب جنگ احد کا تذکرہ فرماتے تو کھا کرتے تھے۔"یہ جنگ ساری کی ساری طلحہ کے لیے تھی۔" (یعنی اس جنگ کے مرد میدان(man of the war) سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے اپنی جان کو انتھائی خطرے میں ڈال کر دشمنوں کے مسلسل حملے روك کر رسول اللّٰہ کے تحفظ کا اصل کارنامہ سرانجام دیا تھا۔)

مذکورۃ الصدر احادیث اور غزوۂ احد کے اس نقشہ کو چشم تصور سے دھرانے کے بعد واضح ھو جاتا ھے کہ واقعتاصحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ قرآن مجید کی ایك آیت پیش کرکے اس گفتگو کو سمیٹتے ھیں۔ اللّٰہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ھیں:

﴿ وَ مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَ لَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ﴾ (التوبة: ۹: ۱۲۰)

" مدینہ کے رھنے والوں کو اور جو دیھاتی ان کے گرد و پیش رھتے ھیں، ان کو زیب نھیں دیتا کہ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (چھوڑ کر جنگ سے) پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ زیب دیتا ھے کہ اپنی جان کو ان کی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں۔" (ابو عمار)

کوئی جھوٹ باندھا یا کوئی غلط بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ (۱۵)

(۱۵) اس بارے رسول اللہ ﷺ نے بہت زیادہ احادیث میں انتباہ فرمایا ہے۔ بطور مثال اور دلیل کے صرف دو احادیث پیش خدمت ہیں:

(۱) سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَ حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَ لَا حَرَجَ، وَ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))

"میری طرف سے پہنچادو خواہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے بیان کر لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بولے اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔"

(صحیح البخاری= کتاب أحادیث الأنبیاء: بابُ مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسرَائِيلَ، : ۳۴۶۱+ ترمذی= کتاب العلم : باب ما جاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل : ۲۶۶۹+ سُنَن الدّارمی= المقدمة: باب البلاغ عن رسول اللّٰہ ﷺ و تعلیم السُّنَن، الحدیث: ۵۴۸+ مسند احمد: ۲/۱۵۹، ۲۰۲، ۲۱۴)

(۲) سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُرَىٰ أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِينَ))

"جو مجھ سے ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں گمان یہ ہو کہ وہ جھوٹی ہے تو وہ بیان کرنے والا جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔"

(صحیح مسلم=المقدّمة: بابُ وُجُوبِ الرِّوَايَةِ عَنِ الثِّقَاتِ وَ تَرْكِ الْكَذَّابِينَ وَالتَّحْذِيرِ مِنَ الْكَذِبِ عَلَىٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ + التِرمذی= کتاب العِلم: بابُ مَا جَاءَ فِي مَن رَوَىٰ حَدِيثًا وَ هُوَ يَرَىٰ أَنَّهُ كَذِبٌ، الحدیث: ۲۶۶۲)

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے کوئی ضعیف اور موضوع حدیث بیان کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بلکہ اپنا گھر جہنم میں بنانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام حدیث بیان کرتے وقت اس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے کہ اگر کسی لفظ اور جملہ پر شک ہوتا تو دونوں قسم ←

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی کوئی حدیث یا تو بیان ہی نہ کرتے تھے یا پھر انتہاء درجہ کی حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اسی لیے مؤرخین نے یہ اصول قائم کیا کہ

"اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوْلٌ" (۱۶)

اب بتلایے! دنیا کی کسی تاریخ کے مؤرخ میں یہ خصوصیات پائی جاتیں ہیں؟ اگر اس بات کا جواب نفی میں ہے، تو حدیث کی حیثیت تاریخ کی کیسے ہوسکتی ہے؟

۳۔ اَلْمُسْنَدُ:

کا مطلب یہ ہے کہ کسی حدیث میں جس قدر رُواۃ (راویان حدیث) آتے ہوں۔ سب کو بالترتیب ذکر کر دیا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں نہ تو انقطاع ہو، نہ تدلیس اور نہ ہی کوئی علت۔ خواہ یہ روایت کسی تابعی پر ختم ہوتی ہو یا صحابی پر یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر، بالفاظ دیگر صحیح بخاری میں صرف سنن رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ذکر نہیں بلکہ صحابہ و تابعین کے آثار کا بھی ذکر ہے۔

یہ سلسلہ اسناد صرف احادیث کے ساتھ مخصوص ہے۔ دنیا بھر کی کسی دوسری تاریخ میں ایسا التزام و اہتمام نہیں۔ پھر ان رواۃ (راویان روایت) کی ثقاہت کی جانچ پڑتال کے لیے اسماء الرجال کی لاتعداد کتابیں موجود ہیں کہ اگر اس سلسلہ میں مزید تحقیق کی

ﮯ کے الفاظ اور جملے بیان کر دیتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے یا یہ۔ (ابوعمار)

(۱۶) ترجمہ: "صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں۔ (تَدْرِيْبُ الرَّاوِيْ شَرْحُ تَقْرِيْبِ النَّوَوِيْ: ۲:۲۱٤)

ضرورت پیش آئے۔ تو ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے احادیث کا رتبہ اناجیل اربعہ سے بھی بلند ہے۔

۴۔ اَلْمُخْتَصَر:

کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں ان جملہ احادیث صحیحہ کو درج نہیں کیا گیا، جو امام بخاری کی شرائط پر پوری اترتی تھیں۔ جتنی احادیث سے سیرت طیبہ کے جملہ پہلوؤں پر روشنی پڑسکتی ہے یا ان سے شرعی مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔ اتنی ہی درج کی گئی ہیں۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ''تکرار برائے تکرار'' کے اصول کو نہیں اپنایا گیا۔

۵۔ مِنْ اُمُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ:

یعنی اس کتاب میں صرف ایک ہستی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سے متعلق ہر پہلو پر روشنی ڈالنے والی احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔

یہاں سے تاریخ کا میدان پھر حدیث سے الگ ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں کسی ملک کے ایک طویل دور کی داستان قلمبند کی جاتی ہے۔ علاقہ وسیع، مدت طویل اور مؤرخ ایک شخص یا دو یا چند اشخاص پر مشتمل ادارہ۔ لیکن حدیث میں صرف اور صرف ایک شخص کی ذات کے جملہ پہلوؤں کو قلمبند کیا جاتا ہے۔ اور اس تاریخ ساز ہستی کے ابتدائی مؤرخین (محدثین) کی تعداد کم از کم چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔ جو آپ کی ایک ایک بات کی تحقیق کے لیے مہینوں کا سفر گوارا کر لیتے، مصائب جھیلتے اور بے دریغ مال و دولت صرف کرتے ہیں۔ پھر ان مؤرخین میں جہاں مرد ہیں وہاں عورتیں بھی ہیں۔ جن کی وجہ سے آپ کی خانگی زندگی کا کوئی گوشہ پس پردہ نہیں رہ گیا۔ یہی صورت تھی، جس کی

وجہ سے آپ نے فرمایا تھا:

((جِئْتُ بِدِيْنٍ بَيْضَآءَ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا)) [17]

یعنی ”میں ایسا روشن دین لے کر آیا ہوں۔ جس کی رات بھی اسی طرح تابناک ہے۔ جس طرح اس کا دن۔“

اب بتلایئے! آپ کی ہستی کے سوا دنیا کا کوئی انسان: خواہ وہ پیغمبر ہو یا بادشاہ، جرنیل ہو یا فاتح، ایسا ہے جس کی سوانح حیات اس انداز میں لکھی گئی ہو؟ یقیناً ایسی کوئی تاریخ نہ آپ ﷺ سے پہلے مرتب ہوئی اور نہ ہی آئندہ تا قیامت ہو سکتی ہے۔ پھر حدیث اور تاریخ کا درجہ ایک جیسا کیونکر ہو سکتا ہے؟

۶۔ وَسُنَنه وَاَيَّامه :

” اَيَّامِه“ کے الفاظ سے گو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ یا اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ ہے۔ جب اس لفظ کو ”سُنَنِه“ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ نہیں۔ صرف عرب کے علاقہ کی بھی

[17] مُسْنَد احمد: اس کی سند صحیح ہے۔ دیکھئے: فَتْحُ الرَّبَّانِیْ لِتَرْتِيْبِ مُسْنَدِ الْاِمَامِ اَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلِ الشَّيْبَانِيْ لِاَحْمَدَ عَبْدِالرَّحْمَانِ اَلْبَنَّاء: اَلْقِسْمُ الْاَوَّل: كِتَابُ الْاِعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ: بَابٌ فِي الْاِعْتِصَامِ بِسُنَّتِه ﷺ وَالْاِهْتِدَاءِ بِهَدْيِه ۔ شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ھیں: اس کی سند کثرت طرق کی وجہ سے صحیح ھے۔ دیکھئے: المشکاۃ بتَحْقِيْقِ الْاَلْبَانِيْ، الحدیث: ۱۷۷) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ھیں: یہ حدیث حسن ھے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد ، امام ترمذی، امام ابن ماجہ (رحمہم اللہ) نے بھی الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ روایت کیا ھے۔

نہیں۔ صرف اس دور کی بھی نہیں بلکہ کتب احادیث میں جملہ نوع انسانیت کے لیے اور قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات کے اصول بیان کیے گیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس تاریخ نویسی میں ایسی کڑی شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اب اگر ''طلوع اسلام'' صحیح البخاری کے اس پورے نام سے صرف آخری لفظ ''ایّامِہٖ'' سے ثابت کرے کہ یہ محض تاریخ ہے اور ثابت بھی اس انداز سے کرے کہ اس میں اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں چنداں فرق نہیں اور وہ ظنی ہونے کے لحاظ سے برابر ہیں تو سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

''بریں عقل و دانش بباید گریست'' ⑱

اب ہم تاریخ اور حدیث کے اس فرق کو نکات وار پیش کرتے ہیں۔ تاکہ یہ فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔

تاریخ اور حدیث کا تقابل

① تاریخ کی بنیاد افواہوں پر رکھی جاتی ہے۔ جنہیں بعد میں قرائن و قیاسات سے ترتیب دے کر تاریخ مرتب کر لی جاتی ہے۔

جبکہ: حدیث کا مواد عینی شاہدوں کے بیانات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان شاہدوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو سفر و حضر غرض یہ کہ ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ اور آپ ﷺ کے

---

⑱ ''ایسی عقل و دانش پر آنسو بہانے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے؟''

صحبت میں رہتے تھے۔ مثلاً: سیدنا انس، سیدنا ابوہریرہ، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

② مؤرخ کا صاحبِ تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جبکہ: محدثین کا صاحب حدیث سے گہرا قلبی لگاؤ ہونا ضروری ہے۔

③ مؤرخ کے ذاتی کردار کو کبھی زیر بحث نہیں لایا جاتا۔

جبکہ: محدثین کا قابل اعتماد ہونا ضروری شرط ہے اور سب سے پہلے راوی کا کردار ہی زیر بحث لایا جاتا ہے۔

④ تاریخ کا تعلق کسی خاص ملک اور خاص دور سے ہوتا ہے۔

جبکہ: حدیث کا تعلق تمام نوع انسانیت سے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔

⑤ تاریخ میں کسی حکمران اور اس کے قبیلہ (یا اس کی کابینہ) کے حالات قلم بند کیے جاتے ہیں۔

جبکہ: حدیث کے سلسلہ میں محدثین کے لیے قابل ذکر صرف ایک ہستی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

⑥ تاریخ کا مؤرخ کبھی صرف ایک شخص ہوتا ہے کبھی دو یا دو سے زیادہ چند اشخاص پر مشتمل حکومت کا کوئی ادارہ ہوتا ہے۔

جبکہ: ابتدائی راویوں کے تعداد چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔ پھر بعد میں اس سلسلہ میں منسلک ہونے والے بھی شامل کیے جائیں تو یہ تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔

⑦ مؤرخین کی تعداد کم اور حلقہ تحقیق زیادہ ہونے کی وجہ سے اکثر غلطیوں کا امکان ہوتا

جبکہ: محدثین کی تعداد کثیر اور حلقہ تحقیق صرف ایک ہستی ہونے کی وجہ سے غلطی کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ پھر ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی لکھی ہوئی احادیث کی رسول اللہ ﷺ سے تصحیح وتصویب بھی کرالی تھی۔

⑧ مورخ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ وضاحت کرے کہ اس نے یہ مواد کن ذرائع سے حاصل کیا ہے۔ تاکہ دیکھا جاسکے کہ آیا وہ ذرائع قابل اعتماد بھی ہیں یا نہیں؟

جبکہ: محدث کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان تمام ذرائع اور اسانید کا ذکر کرے، پھران ذرائع کا بھی قابل اعتماد ہونا ضروری ہوتا ہے۔

⑨ تاریخ کا میدان صرف کسی علاقہ میں مخصوص دور کے سیاسی نظام کو قلمبند کرنا ہے۔ پھر اس میں اس دور کی تہذیب وتمدن پر بھی کچھ روشنی پڑ جاتی ہے۔

جبکہ: حدیث کا میدان اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ ہر وہ بات جس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ہو، وہی اس کا میدان ہے۔ پھر ان ابتدائی محدثین میں چونکہ عورتیں بھی شامل ہیں۔ لہٰذا آپ کی خانگی زندگی کا ہر گوشہ سامنے آجاتا ہے۔

⑩ تاریخ نویسی میں مؤرخ کے ذاتی اور قومی رجحانات کو بڑا دخل ہے۔ لہٰذا ہر دور میں کسی مخصوص علاقہ کی تاریخ موڑ توڑ کر پیش کی جاتی ہے۔

جبکہ: حدیث کے معاملہ میں صورت حال یہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاں محدثین کی تعداد کی یہ کثرت ہو اور ان میں ملک ملک کے باشندے شامل ہوں تو ایسے احتمالات ختم ہو جاتے ہیں۔

⑪ تاریخ کے سلسلہ میں غلط بیانی اور غلط نویسی پر کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ لہٰذا مؤرخ اپنی رائے کے مطابق بات کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔

جبکہ: حدیث کے معاملہ میں غلط بیانی کی صورت میں جہنم کی وعید کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ لہٰذا محدث پوری حزم و احتیاط اور وثوق سے بات کہتا ہے، یا پھر چپ رہتا ہے۔

⑫ تاریخ لکھنے والے مؤرخ یا ادارے معقول معاوضے پاتے ہیں اور حکومتوں کا اس تاریخ نویسی پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

جبکہ: محدثین کا کچھ لینا تو درکنار۔ انھوں نے اپنا تن، من، دھن سب کچھ اس راستہ پر نثار کر دیا۔

احادیث اور اناجیل:

ذرا غور فرمایئے! جن معیاروں پر اس اسوۂ حسنہ کو کس کر پیش کیا گیا ہے۔ کیا دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ تاریخ تو درکنار انجیل تک کا یہ حال ہے کہ اس کے ابتدائی راوی صرف چار (۴) ہیں۔ پھر انھوں نے بھی خود قلمبند نہیں کی۔ بلکہ بعد میں آنے والے شاگردوں نے کی۔ سلسلہ اسناد کا کوئی ذکر نہیں۔ روایت اور درایت کا کوئی معیار نہیں۔ تورات قوم موسیٰ کو لکھی لکھائی مل گئی۔ جو بعد میں دو دفعہ ضائع ہوئی۔ پھر سینکڑوں سال بعد دوبارہ ضبط تحریر میں لائی گئی۔ ان دونوں کتابوں میں قرآن کی رو سے تحریف بھی ثابت ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کتابوں سے کبھی اتنا بدظن نہیں کیا۔ جتنا ہمارے یہ کرم فرما ہمیں اس ذخیرۂ حدیث سے

بدظن کرنا چاہتے ہیں جو انسان کی ممکنہ کوششوں کی حد تک مُنَقَّح (غلطیوں سے پاک) کر دیا گیا ہے۔

اعجازِ حدیث:

اس سے بھی زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ آیا اس اسوۂ حسنہ کی حفاظت کا یہ اہتمام محض اتفاقی طور پر ہوگیا ہے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کی کوئی اور مثال بھی مل جانی چاہیے تھی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا ہم لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسوۂ رسول ﷺ کی ایسی حفاظت کے سلسلہ میں دست قدرت بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ان لوگوں کو ایسا حافظہ اور ہمت دی۔ جس کی مثال بعد میں نہیں ملتی۔ پھر انھیں دولت سے نوازا۔ تو انھوں نے بے دریغ اس مقصد پر خرچ کیا اور اپنی انتھک جسمانی اور دماغی کوششوں سے اس فریضہ کو سرانجام دینے والی پاک باز جماعت پیدا کی۔ تو کیا یہ سب امر اتفاقی تھا؟ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر کے اس اسوۂ رسول ﷺ اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری پوری کر دی۔ جس کا اس نے ذمہ لے رکھا تھا اور جسے تا قیامت باقی رہنا تھا۔ ورنہ اس اسوہ کی حفاظت کے بغیر قرآن کے الفاظ کی حفاظت تو کچھ معنی نہیں رکھتی۔



تیسرا اعتراض

کثرت احادیث

احادیث کی عددی کثرت کے اسباب:

علم حدیث پر منکرین حدیث نے یہ اعتراض بھی بڑی شدومد سے اٹھایا ہے کہ محدثین کے پاس اتنی تعداد میں احادیث آ کہاں سے گئیں؟ وہ نہایت مہیب اور مدہش اعدادو شمار پیش کر کے قارئین کرام کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان میں سے 95% موضوع اور جعلی احادیث تھیں۔ جو پانچ فیصد صحیح احادیث تھیں بھی تو وہ اس طرح غلط ملط ہو گئی تھیں کہ ان کو الگ کر دینا کسی بھی انسان کے بس کا روگ نہ تھا۔ لٰہذا محدثین نے اپنے فہم وبصیرت کے مطابق جو بھی احادیث قبول کی ہیں۔ وہ بھی چنداں قابل اعتبار نہیں۔ حالانکہ کثرت تعداد احادیث کے درج ذیل پانچ اسباب میں سے صرف ایک سبب موضوع احادیث کا وجود ہے۔ وہ اسباب درج ذیل ہیں:

(۱) بلحاظ وسعت معانی:

سنن اور احادیث میں جو فرق ہے وہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں۔ سنن کا تعلق صرف رسول اللہ ﷺ کی ایک ذات سے ہے۔ جب کہ احادیث کا تعلق بیشمار صحابہ اور تابعین

کے اقوال وافعال سے بھی ہے۔ لہٰذا احادیث کی تعداد سنن رسول ﷺ سے کئی گناہ زیادہ ہونا لازمی امر ہے۔

(۲) بلحاظ اَسناد اور طُرق:

جس کی مثال ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ «اِنَّمَا الْاَ عْمَالُ بِالنِّیَّاتِ» ⑲ ایک سنت قولی ہے۔ جب کہ احادیث کے لحاظ سے اس کا شمار سات سو (۷۰۰) ہے۔ اس لحاظ سے بھی احادیث کی تعداد سنن سے بیسیوں گنا بڑھ جاتی ہے۔

(۳) سنت رسول ﷺ کا دارومدار زیادہ تر تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم پر:

دور نبوی میں سنت کا دارومدار کتابت و روایت سے زیادہ تعامل صحابہ پر تھا۔ مثلاً صحابہ آپ کو جیسے نماز پڑھتے دیکھتے ویسے ہی پڑھ لیتے۔ یا جو وفود باہر سے مدینہ آتے۔ آپ انھیں چند دن اپنے پاس ٹھہرا کر، جاتے وقت یہ وصیت کرتے کہ «صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ» ⑳

یا آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: «خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ» ㉑

---

⑲ ترجمہ: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے"
صحیح البخاری، کتاب بَدْءُ الْوَحْیِ، باب کیف کان بدء الوحی …… الخ :۱+ صحیح مسلم=کِتَابُ الْاِمَارَۃِ: بَابُ قَوْلِہٖ ﷺ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ)) :۱۹۰۷

⑳ ترجمہ: "نماز ایسے پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔" صحیح البخاری: کِتَابُ الْاَذَانِ: بَابُ الْاَذَانِ لِلْمُسَافِرِیْنَ اِذَا کَانُوْا جَمَاعَۃً …… الخ :۶۳۱۔

㉑ ترجمہ: "مجھ سے حج کے ارکان کی ادائیگی کے طریقے سیکھ لو۔"
تخریج: (سُنَنُ الْکُبْرٰی لِلْبَیْهِقِیْ۔ کِتَابُ الْحَجِّ: بَابُ الْإِیضاع فِیْ وَادِیْ مُحَسِّرُ ◄

پھر جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ اور دوسرے احکام کے کوائف و تفصیلات کو روایت و کتابت کرنا شروع کیا تو انھیں چھوٹے چھوٹے ارشادات سے دفتر کے دفتر تیار ہو گئے۔

(۴) موضوع احادیث کا وجود:

اس ضمن میں ہم اپنے مضمون ''وضع حدیث اور وضاعین'' میں بھر پور تبصرہ پیش کر چکے ہیں۔ ㉒

(۵: ۱۲۵)، الحدیث: ۹۵۲٤۔یہ روایت صحیح ہے۔ دیکھئے: إرواء الغلیل ،الحدیث: ۱۰۷٤، اس حدیث کو الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام ابو نعیم، امام ابو یعلٰی اور امام احمد(رحمۃ اللہ علیہم) نے بھی روایت کیا ہے۔

㉒ مصنف نے اس موضوع پر بڑی تفصیل اور دلیل سے گفتگو فرمائی ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو مصنف رحمہ اللہ کی کتاب ''آئینۂ پرویزیت'' کے حصہ چہارم کے پہلے باب کا ایک عنوان ''وضاعین کون تھے؟'' نیز ملاحظہ ہو حصہ چہارم کا چھٹا باب ''وضع حدیث اور وضاعین۔'' آپ کی گفتگو کا ماحاصل یہ ہے کہ:

''مسلمانوں میں منافقین اور مرتدین کا ایک گروہ شامل تھا۔ جو آپ کی وفات کے بعد کھل کر سامنے آگیا تھا۔ ایک واقعہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوا جس کو ابن عدی نے کامل میں سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے۔ پھر اس کے بعد وضاعین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ وہ حدیثیں گھڑنے والے چھ(٦) قسم کے لوگ تھے:

١۔ زنادقہ(سیکولرز) ٢۔ اہل تشیع ٣۔ صوفیہ
٤۔ امراء وسلاطین ٥۔ معتزلین ٦۔ خوارج

انھوں نے اپنے اپنے فرسودہ نظریات اور باطل عقائد کو سچا ثابت کرنے

(۵) موضوع احادیث کے طرق اور اسناد:

ہم محولہ بالا مضمون میں یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ محدثین کو موضوع احادیث کے ساتھ ساتھ ان کی اسناد کو بھی یاد رکھنا پڑتا تھا۔ تاکہ ان سے عوام کو متنبہ رکھ سکیں۔ تو جس طرح سنن رسول ﷺ جب طرق کے لحاظ سے بیان کی جاتی ہیں تو احادیث بیسیوں گنا بڑھ جاتی ہیں۔ اس طرح موضوع احادیث بھی طرق کے لحاظ سے کئی گنا زیادہ شمار ہونے لگی تھیں۔

کثرت احادیث کی بات جب چل ہی نکلی تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لگے ہاتھوں ان اعتراضات کا بھی جائزہ لیتے چلیں جو اس سلسلہ میں ''طلوع اسلام'' کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں:

حدیثوں کی تعداد:

احادیث کو مشکوک ثابت کرنے کے لیے حدیثوں کی تعداد کو جس انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے۔ مقام حدیث کے صفحہ نمبر ۲۵ پر زیر عنوان ''کتنی حدیثوں کو رد کر دیا'' لکھتے ہیں:

''ضمناً یہ بھی دیکھیے! ان حضرات کو کس قدر احادیث ملیں اور ان سے انھوں نے کتنی احادیث کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں داخل کیا:

➢ کے لیے بے شمار احادیث خود گھڑ لیں تھیں۔ جن سے وہ اپنے عقائد کا دفاع کرتے اور اھل حق کے نظریات کارد کرتے۔ پھر ایك ایك موضوع حدیث کو کئی کئی اسناد سے جب بیان کیا جائے تو لامحالہ بظاھر احادیث و روایات کی تعداد بھت زیادہ محسوس ھو گی۔

① ...... امام بخاری رحمہ اللہ:

چھ لاکھ (۶،۰۰،۰۰۰) میں سے مکررات (تکرار والی) نکال کر صرف ۲۷۶۲؟

② ...... امام مسلم رحمہ اللہ:

تین لاکھ (۳،۰۰،۰۰۰) میں سے مکررات نکال کر صرف ۴۳۴۸

③ ...... امام ابوداؤد رحمہ اللہ:

پانچ لاکھ (۵،۰۰،۰۰۰) میں سے مکررات نکال کر صرف ۴۸۰۰

④ ...... امام ترمذی رحمہ اللہ:

(امام ترمذی کی روایات اور تعداد درج کرنا چھوڑ گئے ہیں)

⑤ ...... امام ابن ماجہ رحمہ اللہ:

چار لاکھ (۴،۰۰،۰۰۰) میں سے مکررات نکال کر صرف ۴۰۰۰

⑥ ...... امام نسائی رحمہ اللہ:

دو لاکھ (۲،۰۰،۰۰۰) میں سے مکررات نکال کر صرف ۴۳۲۱

ظاہر ہے کہ جب رد و قبول کا دارومدار جامع الأحادیث (احادیث جمع کرنے والے) کی ذاتی بصیرت ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ لاکھوں کے انبار میں سے جنہیں ان حضرات نے مسترد قرار دے دیا تھا کتنی صحیح حدیثیں بھی ضائع ہوگئیں ہوں گی؟ باقی رہا یہ معاملہ کہ جن احادیث کا ان حضرات نے انتخاب کیا۔ ان میں کتنی حدیثیں ایسی آگئی ہوں گی جسے کسی صورت میں بھی حضور اکرم ﷺ کے اقوال یا افعال قرار نہیں دیا جاسکتا۔''

(مقام حدیث صفحہ نمبر: ۲۵،۲۶)

امام بخاری کے متعلق ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

’’انھوں نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ (٦،٠٠،٠٠٠) کے قریب احادیث جمع کیں۔ان میں سے انھوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف ٢٠٠ ٧ احادیث کو صحیح پایا اور انھیں اپنی کتاب میں درج کر لیا باقی پانچ لاکھ ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا۔ (مقام حدیث صفحہ نمبر:٢٢)

اور تیسرے مقام پر امام بخاری رحمہ اللہ کے متعلق فرمایا:

’’ذرا سوچئے کہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ پانچ لاکھ چورانوے ہزار (٥،٩٤،٠٠٠) احادیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی دانست میں رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتیں اور اس سے منکر حدیث نہیں قرار پاتے تو اگر آج کوئی شخص ایک حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی بصیرت قرآن کی رو سے (یہ حدیث) رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتی تو وہ کافر اور خارج از اسلام کس طرح قرار پا سکتا ہے؟ وہ درحقیقت ایک جامع حدیث کے فیصلے یا راوی کی روایت کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے۔ ارشاد نبوی سے انکار نہیں کرتا‘‘ (مقام حدیث صفحہ نمبر:٥٦)

مندرجہ بالا اقتباسات سے درج ذیل امور قابل غور ہیں:

کذب بیانی اور دھوکہ دہی:

اقتباس نمبر ایک میں مندرجہ احادیث کی تعداد بیس (٢٠) لاکھ (٢٠،٠٠،٠٠٠) سے متجاوز ہے۔ جب کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو روایات میں مذکور ہے وہ چودہ لاکھ (١٤،٠٠،٠٠٠) ہے۔جس میں صرف مندرجہ بالا محدثین ہی شامل نہیں بلکہ دوسرے

محدثین بھی شامل ہیں اور اس کثرت تعداد کے پانچ اسباب ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ گویا یہ تعداد مختلف طرق و اسانید کی ہے نہ کہ متون، سنن اور آثار کی۔ چونکہ محدثین ہر طریق اور سند کو الگ حدیث شمار کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ تعداد انھیں کے شمار کے مطابق ہے۔ متون کے شمار کے مطابق نہیں۔

احادیث کی اصل تعداد:

مکرّرات نکال کر جو اعداد و شمار بیان کیے ہیں وہ متون، سنن اور آثار مندرج ہیں۔ جسے عرف عام میں حدیث کہا جاتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار سے متجاوز نہیں۔ پھر بے شمار ایسی احادیث ہیں۔ جو مندرجہ بالا مختلف مجموعوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی اصل تعداد نصف سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ امام حاکم کی تحقیق کے مطابق صحاح ستہ کے علاوہ مسند احمد بن حنبل سمیت صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

« اَلَاحَادِيْثُ الَّتِيْ فِي الدَّرَجَةِ الْأُوْلٰى لَا تَبْلُغُ عَشَرَةَ آلَافٍ »

(تَوْجِيْهُ النَّظَرِ بحواله "تدوين حديث" صفحه نمبر: ۲۰۰)

''اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی''

اب اگر دس ہزار میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کی جائے اور صرف صحیح اور اعلیٰ درجہ کی احادیث کے علاوہ حسن اور ضعیف روایتوں کو بھی لیا جائے اور صحاح ستہ اور مسند احمد کے علاوہ دوسری بیسیوں کتب احادیث کو بھی، جن کا شمار طبقہ سوم اور چہارم میں ہوتا ہے۔ تو ان کی مجموعی تعداد کے متعلق جناب مناظر احسن گیلانی اپنی تصنیف ''تدوین

حدیث'' میں لکھتے ہیں:

''بہر حال شمار کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صحیح، حسن، ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ، مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کی تعداد پچاس ہزار (۵۰،۰۰۰) بھی نہیں ہے۔ اور یہ ہر رطب و یابس کے مجموعہ کی تعداد ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر ابن جوزی ہی نے نہیں، جن کی تنقید کا معیار بہت سخت ہے۔ بلکہ امام حاکم نے، جو نرمی اور مسامحت میں مشہور ہیں، کہا ہے: ''اول درجہ کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی'' (تدوین حدیث:۱۹۵)

یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس پچاس (۵۰) ہزار کی تعداد میں احادیث کی جملہ اقسام (خواہ وہ احادیث مقبول کے ضمن میں آتی ہوں یا مردود کے) شامل ہیں۔ مردود احادیث کی اقسام میں موضوعات سب سے کم تر درجہ کی ہیں۔ پھر جب ہمارے طبقہ سوم اور چہارم میں بالخصوص موضوعات کی ایک کثیر تعداد موجود ہے تو اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے؟

ذخیرۂ احادیث میں رطب و یابس کا اندراج:

رہا یہ سوال کہ محدثین نے ہر طرح کے رطب و یابس کو اپنے مجموعوں میں کیوں شامل کر دیا؟ تو اس کا جواب ہم ''وضع حدیث'' میں دے چکے ہیں۔ مختصراً یہ ہے کہ باطل فرقوں کے اس اعتراض کی گنجائش کو ختم کر دیا گیا ہے کہ ''محدثین نے ہماری روایات کو ضائع کر دیا ہے حالانکہ وہ صحیح تھیں۔''

صحیح احادیث کی صحت کی عقلی دلیل:

بات ہو رہی تھی صحیح احادیث کی کل تعداد کی کہ وہ دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی۔ تو اب اس تعداد کا اس تحریری سرمایۂ احادیث سے مقابلہ کیجیے۔ جو عہد نبوی میں تحریر ہو چکا تھا۔ جس کی تفصیل ہم کتابت حدیث میں پیش کر چکے ہیں اور جس کا ''طلوع اسلام'' کو بھی اعتراف ہے۔ کیا اس بات سے یہ حقیقت واضح نہیں ہو جاتی؟ کہ تیسری اور چوتھی ہجری میں اگر سرمایہ حدیث میں کچھ اضافہ یا ملاوٹ ہوئی بھی تھی تو محققین کی جماعت نے اس کی نشاندہی کر کے اسے پھر سے علیحدہ کر دیا ہے اور اس اسوۂ رسول ﷺ کے صحیح خدوخال نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ جس کی اتباع تا قیامت مسلمانوں کے لیے فرض قرار دی گئی تھی اور جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے انسانی دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داری انسانوں کے ذریعہ ہی پوری کراتا ہے اور جن انسانوں نے اس ذمہ داری کو پورا کیا وہ یہی محدثین کرام رحمہم اللہ کی جماعت تھی۔

''طلوع اسلام'' کا سفید جھوٹ:

آپ دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا تینوں اقتباسات میں احادیث کے رد و قبول کے سلسلہ میں ''طلوع اسلام'' نے محدثین (بالخصوص امام بخاری رحمہ اللہ) کے متعلق ''ذاتی بصیرت، اپنے معیار اور اپنی دانست'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ جھوٹ اس لیے ہے کہ محدثین نے احادیث کے رد و قبول کے لیے اپنی دانست یا بصیرت کو قطعاً معیار نہیں بنایا۔ بلکہ ان کا معیار روایت و درایت یا چھان بین کے وہ اصول تھے جن کی ابتداء سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خود کی تھی اور بتدریج ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے محدثین تک

پہنچے تھے۔ نیز یہ سفید جھوٹ اس لیے بھی ہے کہ ''طلوع اسلام'' نے اسی کتاب ''مقام حدیث'' کے صفحہ: ۱۰۷، اور صفحہ: ۱۵۸ پر ان اصولوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

روایت کے معیار کے لیے صفحہ: ۳۰ پر اسماء الرجال، صفحہ: ۲۴ پر ثقاہت کا فیصلہ، صفحہ: ۱۰۷ تا ۱۱۲ پر تنقید حدیث، صفحہ: ۱۱۹، ۱۲۰ پر روایت اور شہادت، وغیرہ عنوانات کے تحت جو تبصرہ اور تنقید پیش کی گئی ہے۔ اگر روایت کے معیار کے لیے محدثین کے ہاں کوئی اصول ہی نہ تھے اور وہ محض اپنی دانست اور بصیرت سے رد و قبول کرتے تھے تو پھر ادارہ مذکور کو مندرجہ بالا موضوعات پر تبصرہ فرمانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حدیثوں کے ضیاع کی فکر:

فرماتے ہیں کہ'' ان لاکھوں کے انبار میں جنہیں ان حضرات نے مسترد کر دیا تھا کتنی صحیح حدیثیں بھی ضائع ہوگئی ہوں گی۔''

ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ فکر تو ان لوگوں کو ہونی چاہیے جن کے ہاں حدیث کی کچھ اہمیت ہے اور وہ اسوۂ رسول ﷺ کو واجب الاتباع اور دین کا حصہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جن کے ہاں صحیح حدیث کی بھی فقط اتنی ہی اہمیت ہو کہ وہ صرف عہد نبوی میں ہی واجب الاتباع یا اسوۂ حسنہ تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب زمانہ کے حالات بدل چکے ہیں اور نہ ہی وہ اسے دین کا حصہ سمجھتے ہیں۔ انھیں ایسی فکر کیوں ہو؟

تاہم اطلاعاً عرض ہے کہ صحیح البخاری میں مرویات (مع اخبار و آثار) کی کل تعداد ۹۶۸۴ ہے۔ اگر آثار اور مراسیل کو حذف کر دیا جائے تو باقی مرفوع احادیث کی تعداد مکررات نکالنے کے بعد ۲۶۲۳ رہ جاتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے باقی پانچ لاکھ

نوے ہزار کو مسترد نہیں کیا تھا بلکہ چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ امام مذکور کی یہ کتاب "المُختَصَر" بھی ہے۔ پھر ایسی نظر انداز شدہ صحیح احادیث جو امام مذکور کی شرائط پر پوری اترتی تھیں وہ بھی ضائع نہیں ہوئیں۔ بلکہ بعد میں آنے والے محدث امام حاکم نے انھیں اپنی تصنیف ''مستدرک حاکم'' میں جمع کر دیا ہے۔ لہٰذا اس بات پر افسوس کی ضرورت نہیں کہ دین کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہوگا۔

''طلوع اسلام'' کی اصل شکایت:

اب تیسرے اقتباس کو پھر سامنے لائیے: جو یہ ہے۔

''ذرا سوچئے کہ اگر امام بخاری پانچ لاکھ چورانوے ہزار (۵،۹۴،۰۰۰) احادیث کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان کی دانست میں رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتیں اور وہ منکر حدیث نہیں قرار پاتے تو اگر آج کوئی شخص ایک حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی قرآنی بصیرت کی رو سے (یہ حدیث) رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی تو وہ کافر اور خارج از اسلام کس طرح قرار پا سکتا ہے؟ وہ درحقیقت ایک جامع حدیث (احادیث جمع کرنے والے) کے فیصلے یا راوی کی روایت کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے۔ ارشاد نبوی سے انکار نہیں کرتا۔''

اس سوال پر تو دراصل ''طلوع اسلام'' ہی کو سوچنا زیادہ مناسب تھا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لیکن اس نے سوچنے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی۔ یہ سوال جن غلط مفروضوں کو اکٹھا کر کے بنایا گیا ہے ان کی کچھ وضاحت ہم ذیل میں کیے دیتے ہیں:

① امام بخاری رحمہ اللہ نے جن احادیث کو چھوڑا ان کی حیثیت تین قسم کی تھی:

ا۔ محض طرق واسانید، شواہد وتوابع کی، جن کا درج کرنا ضروری نہ تھا۔

ب۔ ایسی احادیث جو آپ کی مقرر کردہ شرائط پر پوری نہ اتر سکیں۔ مثلاً: آپ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ راویوں کا محض ہم عصر ہونا کافی نہیں بلکہ ان کی ملاقات کا ثابت ہونا بھی شرط ہے۔ لیکن امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ملاقات شرط نہیں، لہٰذا بہت سی ایسی صحیح احادیث ہیں جنہیں امام بخاری رحمہ اللہ نے چھوڑ دیا لیکن امام مسلم رحمہ اللہ نے انھیں اپنی صحیح میں درج کیا ہے۔ گویا امام بخاری رحمہ اللہ کا بعض حدیثوں کو چھوڑنا، حدیث کے فِیْ نَفْسِہٖ صحت وسقم کی بناء پر نہ تھا بلکہ ان کی مقرر کردہ شرائط پر پورا نہ اترنا تھا۔

ج۔ پھر آپ نے اپنی شرائط پر پوری اترنے والی بھی بہت سے حدیثوں کو اس لیے نظرانداز کر دیا کہ ان کا پورا مفہوم پہلی منتخب شدہ احادیث میں آ چکا تھا۔

(۲) امام بخاری رحمہ اللہ نے احادیث کی تحقیق میں اپنی دانست یا پسندیدگی و ناپسندیدگی سے کام نہیں لیا بلکہ روایت ودرایت کے ان کڑے معیاروں کو ملحوظ رکھا ہے۔ جن کی بنیاد سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ڈالی پھر اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے، وہ دوسری صدی ہجری کے آخر تک ایک مکمل فن کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس فن کے جملہ علوم کے ماہر تھے اور انھوں نے صحیح بخاری کو مرتب کرنے سے پہلے خود سے بھی اس فن پر چند کتابیں لکھیں۔

(۳) امام بخاری رحمہ اللہ کی دانست یا بصیرت محض قرآنی نہ تھی بلکہ دینی تھی۔ جس میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہے۔ جو انھیں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی راہ سے ملی۔

تبع تابعین کا دور ۲۲۰ ہجری اور بقول بعضے ۲۶۰ ہجری ہے اور امام صاحب کی پیدائش ۱۹۴ ہجری اور وفات ۲۵۷ ہجری ہے۔ لہٰذا آپ کو تبع تابعین سے استفادہ کا بھرپور موقع ملا ہے۔ پھر یہ دینی بصیرت بھی محض متوارث نہ تھی۔ بلکہ یہ بصیرت بھی روایت ودرایت کے معیاروں کی سختی سے پابند تھی۔ اسی بصیرت کے تحت آپ نے لاکھوں کے انبار سے چند احادیث کا انتخاب کیا اور جن احادیث کو آپ نے صحیح سمجھا ان پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں نے بھی اسے واجب العمل قرار دیا۔ تا آنکہ کوئی حدیث مزید رد وقدح کے بعد صحت کے معیار سے گر نہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتخاب پر ہر طرف سے مدح وتحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کفر یا خروج از اسلام تو دور کی بات ہے، جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔

کفر کی اصل وجہ:

اب اس قرآنی بصیرت والے شخص کی طرف آیئے۔ اس کی قرآنی بصیرت کے ماخذ دو ہیں:

(1) ......دور جاہلیت کی عربی لغت۔

(2) ......زمانہ بھر میں پھیلے ہوئے جدید اور ملحدانہ افکار ونظریات۔

اب یہ شخص ان افکار ونظریات کو لغت سے کام لے کر اپنی عقل کی روشنی میں قرآن میں سمونا چاہتا ہے۔ وہ شخص تحریف معنوی، آیات کی تقدیم وتاخیر اور ان کے جوڑ توڑ میں بڑا دلیر اور مشاق ہے۔ اب عقل کے لیے یہ کام بھی کیا کم ہے؟ کہ وہ شخص سنن رسول ﷺ کی اطاعت کا پھندا بھی اپنے گلے میں ڈال کر خواہ مخواہ راہ میں رکاوٹیں پیدا کرلے اس

شخص کے لیے احادیث میں مذکور اسوۂ رسول ﷺ کا مفہوم یہ ہو کہ اس کی اتباع صرف صحابہ کے لیے لازم تھی۔ بعد میں آنے والے ادوار میں اسوۂ رسول ﷺ کی اتباع کا مفہوم یہ ہو کہ مرکز ملت جو شریعت وضع کرے اسی کی اتباع فی الحقیقت اسوۂ رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ گویا اس کی نظروں میں تمام تر ذخیرۂ احادیث بے کار بھی ہے اور بعد از وقت بھی۔ لہٰذا آپ ہی بتائیں ایسے شخص کو منکر سنت یا منکر حدیث نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

رہا امام بخاری رحمہ اللہ کی کسی ایک حدیث سے انکار پر کافر اور خارج از اسلام قرار پانے کا مسئلہ تو اس کا کوئی قائل نہیں۔ مقام حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علاوہ اور بھی ''چند نامور ہستیوں'' کے متعلق مذکور ہے کہ وہ بعض حدیثوں کا انکار کر دیتے تھے۔ یا ان پر جرح کی ہے۔ لیکن ان پر محض اس بناء پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا گیا۔ (کہ وہ اس حدیث کے صحیح ہونے پر متفق نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تحقیق کے مطابق وہ حدیث صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی) کفر کا سوال دراصل اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی سنت رسول ﷺ کے صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی اسے واجب الاتباع نہ سمجھا جائے۔

کثرت احادیث اور صحیفہ ہمام بن منبہ رحمہ اللہ:

مقام حدیث صفحہ ۱۹ پر پرویز صاحب لکھتے ہیں: ''اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ امام ہمام بن منبہ ۵۸ ہجری سے پہلے مدینہ میں بیٹھ کر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں اور انھیں صرف ۱۳۸ حدیثیں ملتی ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں جب امام

بخاری رحمہ اللہ احادیث کو جمع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو انھیں چھ (٦) لاکھ احادیث مل جاتی ہیں۔ (امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو دس (١٠) لاکھ اور امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کو بارہ (١٢) لاکھ احادیث ملی تھیں) نیز یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو احادیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ان کے شاگرد کے مجموعہ میں کل ١٣٨ (ایک سو اڑتیس) احادیث ہیں۔ بہر حال پہلی صدی ہجری میں انفرادی طور پر جمع کرنے کی جو کوشش ہوئی اس کا ماحصل صحیفہ ہمام بن منبہ رحمہ اللہ کی ایک سو اڑتیس (١٣٨) احادیث ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے کسی تحریری سرمایہ کا سراغ نہیں ملتا۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں آپ نے دو عدد غور طلب حقیقتیں بیان فرمائیں اور تیسرا انھیں غور طلب حقیقتوں کا نتیجہ۔ اب ہم ان تینوں حقیقتوں پر بالترتیب غور کرتے ہیں:

چند غور طلب حقائق:

پہلی غورِ طلب بات میں ایک اور غور طلب بات ضمناً شامل ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمام بن منبہ ۵۸ھ میں احادیث لکھتے ہیں تو انھیں صرف ١٣٨ (ایک سو اڑتیس) احادیث ملتی ہیں اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ١٢ ہجری سے پہلے لکھنے بیٹھتے ہیں تو انھیں ٥٠٠ (پانچ سو) احادیث مل جاتی ہیں۔ غور کیجیے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمام بن منبہ رحمہ اللہ سے ۴۷ سال پہلے لکھنا شروع کرتے ہیں تو انھیں چار گناہ زیادہ احادیث مل جاتی ہیں۔ پھر یہ بات کیا ہوئی؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پانچ سو احادیث لکھنے کی حقیقت کو "طلوع اسلام" نے مقام حدیث میں کئی مقامات پر تسلیم کیا ہے۔ جہاں تک احادیث کو تحریر میں لانے اور ان احادیث کے صحیح ترین مجموعہ ہونے کا تعلق ہے۔ اس سے کس کو

انکار ہے؟ پھر اس سے ضمناً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے دورِ نبوی میں ۵۰۰ سے زیادہ احادیث بھی تحریر میں آسکتی ہیں۔ جیسا کہ صحیح روایات سے بھی ثابت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک ہزار (۱۰۰۰) احادیث پر مشتمل ''اَلصَّحِیۡفَۃُ الصَّادِقَۃُ'' تحریر کیا تھا۔

✿ دوسری غور طلب بات آپ نے یہ فرمائی کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ان کے شاگردوں کے مجموعہ میں کل ۱۳۸ احادیث ہیں۔ یہ غور طلب مسئلہ بھی دراصل کم فہمی پر مبنی ہے۔ اگر تو ہمام بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں یہ بھی لکھا ہوتا کہ میں نے اپنے استاد سے ساری حدیثیں اخذ کر لی ہیں تو پھر ''طلوع اسلام'' کا اعتراض بجا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ نہ امام ہمام رحمہ اللہ نے کہیں یہ لکھا ہے کہ جو کچھ میں نے اپنے استاد سے اخذ کیا اس کا ماحصل یہی ۱۳۸ احادیث ہیں۔ آج کل بعض لوگ اربعین لکھتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس نے اپنے استاد سے بس یہی چالیس (۴۰) حدیثیں ہی سیکھی ہیں۔ یا اس سے آگے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کے استاد کو یہی چالیس (۴۰) حدیثیں ہی معلوم ہوں گی۔ جہالت پر مبنی نہیں تو اور کیا ہے؟

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے آٹھ سو (۸۰۰) شاگرد تھے۔ جن میں ایک امام ہمام بن منبہ بھی ہیں۔ جس طرح ہر شاگرد نے اپنی بساط کے مطابق استاد سے علم حاصل کیا۔ اسی طرح ہمام بن منبہ رحمہ اللہ نے بھی کیا۔ آپ نے جو مجموعہ مرتب کیا۔ اس کا تعلق صرف اقوالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، یعنی اس میں قولی حدیثیں درج ہیں۔ فعلی اور تقریری وغیرہ

مذکور نہیں۔ پھر ان قولی احادیث میں سے انتخاب میں آپ کی پسند کو بھی خاصا دخل ہے۔ یہ آپ نے کہیں وضاحت نہیں فرمائی کہ جتنی قولی حدیثیں میں نے اپنے استاد سے حاصل کیں۔ وہ سب اس مجموعہ میں درج کر دی ہیں۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے تاریخ حدیث کے دوسرے حصہ انتخاب حدیث میں صرف سات سو (۷۰۰) احادیث درج کی ہیں اور محترم عبدالغفار حسن نے اپنی کتاب انتخاب حدیث میں صرف چار سو (۴۰۰) حدیثیں درج کی ہیں۔ تو کیا اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ ان حضرات کا اپنا یا اپنے استادوں کا علم بس اتنی ہی احادیث تک محدود تھا؟

ان دو قابل غور حقیقتوں کے بعد آپ نے جو نتیجہ پیش فرمایا وہ یہ ہے کہ ''پہلی صدی کے آخر تک ماسوائے ان ۱۳۸ احادیث کے اور کسی تحریری سرمایہ کا سراغ نہیں ملتا۔''

آپ کا یہ نتیجہ جھوٹ کا پلندا اس لیے ہے کہ اس تحریر (صفحہ نمبر: ۱۹ کی تحریر) سے پہلے آپ کو اس تحریری سرمایہ کا بہت کچھ سراغ لگ چکا تھا۔ جو پہلی صدی کے آخر میں نہیں بلکہ دور نبوی میں موجود تھا اور جس کا ذکر آپ نے مقام حدیث کے صفحہ: ۱۰ پر چار (۴) نمبروں کے تحت کیا ہے۔ نیز جس پر ہم کتابت حدیث کے ضمن میں اپنا تبصرہ پیش کر چکے ہیں۔



چوتھا اعتراض

''طلوع اسلام'' کا معیارِ حدیث

مرکزِ ملت کی دریافت کے بعد بھی حدیث کے بہت سے ایسے گوشے باقی رہ گئے تھے۔ جن کی بناء پر ''طلوع اسلام'' کو احادیث کی افادیت کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا تھا کہ اگر احادیث کی روایات کو ناقابل اعتماد قرار دے دیا جائے تو سرے سے قرآن کریم کو ہی اللہ کا کلام اور اس کا محفوظ شکل میں موجود ہونا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی مجبوری کے تحت پرویز صاحب نے فرمایا:

''آپ سوچئے تو کہ اگر احادیث و روایات سے انکار کر دیا جائے تو پھر خود قرآن کے متعلق شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ آخر یہ بھی تو روایات ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے قرآن کو موجودہ شکل میں ترتیب دیا۔'' (مقام حدیث صفحہ: ۳۴۰)

لہٰذا ''طلوع اسلام'' کو اپنی ضرورت اور پسند کی روایات کے لیے کچھ معیار قائم کرنے پڑے جو یہ ہیں:

''جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت داغدار نہ ہوتی

ہو۔" (طلوع اسلام کا مقصد و مسلک، شق نمبر:۱۴)

اس اقتباس سے درج ذیل تین معیار سامنے آئے:

① حدیث قرآن کے مطابق ہو۔

② اس میں رسول اللہ ﷺ پر کسی قسم کا طعن نہ پایا جاتا ہو کہ اس سے آپ کی سیرت داغدار ہو۔

③ یہی اصول کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے بھی سامنے رکھا جانا چاہیے۔

معیار اول، قرآن کے مطابق ہو:

اس معیار پر درج ذیل اعتراض وارد ہوتے ہیں:

① جو حدیث قرآن کے مطابق ہو گی اس کو تسلیم کرنے کا فائدہ کیا ہے؟ کیا اس کے عوض قرآن ہی کافی نہیں؟ قرآن کو اپنی تائید کے لیے کسی حدیث یا روایت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

② جو روایات قرآن کی آیات کی ترتیب بتلاتی اور اس کی محفوظیت کو ثابت کرتی ہیں۔ آپ انھیں کس قاعدہ کی رو سے درست سمجھتے ہیں؟ یا مثلاً یہ کہ نمازوں کی تعداد ہر دن میں پانچ ہے۔ یہ حدیث قرآن کی کون سی آیت کے مطابق ہے؟ پھر کیا یہ حدیث یا ایسی احادیث "طلوع اسلام" کے نزدیک صحیح ہوں گی یا غلط؟ یہ بھی خیال رہے کہ ایسی روایات سے نہ رسول کریم ﷺ کی سیرت داغدار ہوتی ہے نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی۔

③ قرآن تو حروف و الفاظ کا مجموعہ ہے جب تک اس کا کوئی مفہوم متعین نہ کیا جائے

یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں حدیث قرآن کے مطابق ہے یا نہیں؟ اب ظاہر ہے کہ ''طلوع اسلام'' کے قرآنی مفہوم [۲۳] کو صحیح تصور کیا جائے جو کہ ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ تو اس کے مطابق ایک ہی حدیث ایک مقام پر تو صحیح قرار پاتی ہے لیکن دوسرے مقام پر یا دوسرے دور میں وہی حدیث مردود بن جاتی ہے تو اس قسم کی کئی مثالیں آپ کو اس کتاب میں مل سکتی ہیں۔

(۴) اگر قرآن ہی کی ایک آیت دوسری کے مخالف یا متعارض ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ مثلاً ارشاد باری ہے:

(1) ﴿ اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ‌ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ۝﴾ (القصص=۲۸:۵٦)

''(اے محمد!) تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دے سکتا ہے۔ ہدایت والوں سے وہی خوب آگاہ ہے٥''

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(2) ﴿ وَ اِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴾ (الشّورٰی=۴۲:۵۲)

''اور بے شک (اے محمد!) تم سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہو٥''

اسی طرح جبر و قدر کی آیات میں بھی بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ پھر اور بھی کئی ایسے امور ہیں۔ اب ہم چونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے مقامات پر تاویل کے ذریعہ تطبیق پیدا کر لیتے

---

[۲۳] قرآنی مفہوم کے لیے دیکھئے ''آئینۂ پرویزیت'' کا مضمون ''ایمان بالکتاب'' حصہ ششم۔

ہیں۔ [۴۳] پھر جو لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے قول و

[۴۳] اس بات میں کوئی شك نهیں كه قرآن كی آیات اور صحیح احادیث میں كوئی تعارض و تضاد نهیں هے۔ اگر كهیں قرآن كی دو آیات میں بظاهر تضاد نظر آتا هے وه حقیقتاً تضاد نهیں هے۔ بلكه دونوں آیات كا مطلب الگ الگ هے۔ اسی طرح اگر كسی صحیح حدیث اور قرآن كی آیت میں بظاهر تضاد نظر آرها هے تو وهاں پر یه بات سمجهنی چاهیے كه دونوں كا مطلب الگ الگ هے۔ جس طرح دو قرآنی آیات میں تضاد نهیں هو سكتا اسی طرح رسول اللّٰه ﷺ كی صحیح حدیث اور قرآنی آیت میں بهی تضاد نهیں هوسكتا۔

پهلی مثال= قرآن مجید كے ایك مقام كی طرف مصنف رحمہ اللہ نے رهنمائی فرمائی هے۔ ایك سورة القصص كی آیت نمبر ٥٦ هے اور دوسری سورة الشوریٰ كی آیت نمبر:٥٢ هے۔ پهلی آیت میں اللّٰه تعالیٰ ارشاد فرماتے هیں: اے میرے نبی!جس كو پسند كریں اس كو هدایت سے نواز دیں آپ كے پاس یه اختیار نهیں هے ۔بلكه هدایت دینے یا هدایت سے محروم ركهنے كا اختیار همارے پاس هے ۔ اس آیت كا مطلب یه هے كه كسی شخص كے دل میں صراط مستقیم كی هدایت كو اتار دینا۔ اس كو عملی اور واقعاتی طور پر صراط مستقیم پر چلا دینا یه صرف همارا كام هے۔

قرآن مجید كی اس آیت كا مطلب اس آیت كے شان نزول سے بهی واضح هو رها هے ۔یه آیت اس وقت نازل هوئی جب نبی اكرم ﷺ كے همدرد اور غمگسار چچا ابو طالب بن عبد المطلب كا انتقال هونے لگا۔ تو آپ ﷺ نے كوشش فرمائی كه میرے چچا جان ایك دفعه ”لا اله الا اللّٰه“ كهه دیں تاكه قیامت والے دن میں اللّٰه سے ان كی مغفرت كی سفارش كرسكوں۔ لیكن وهاں دوسرے رؤساء قریش كی وجه سے ابو طالب قبول ایمان كی سعادت سے محروم رهے اور كفر پر هی ان كا خاتمه هو گیا۔ نبی ﷺ كو اس بات كا بڑا قلق اور صدمه تها۔ اس موقع پر اللّٰه تعالیٰ نے یه آیت نازل فرما كر نبی ◄

فعل میں تعارض یا خلاف نہیں ہوسکتا۔ تو وہ اگر ایسے مقامات پر تاویل کے ذریعہ تطبیق

اکرم ﷺ پر واضح کردیا کہ آپ کا کام صرف تبلیغ و دعوت اور رهنمائی کرنا هے۔ لیکن هدایت کے راسته پر چلا دینا یه صرف همارا کام هے۔ هدایت اسے هی ملے گی جسے هم هدایت سے نواز نا چاهیں ، نه که اسے جسے آپ هدایت پر دیکهنا پسند کریں۔

(صحیح البخاری= کتاب التفسیر، باب قوله :﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾ :٤٧٧٢ + صحیح مسلم= کتاب الإیمان :باب الدّلیل علی صِحَّةِ الاسلام من حضرةُ الموت...... :٢٤)

جبکه دوسری آیت میں اللّٰه تعالیٰ ارشاد فرماتے هیں:" اے نبی! آپ صراط مستقیم کی طرف رهنمائی کرتے هیں:" اس آیت کا مطلب و مفهوم یه هے که آپ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رهے هیں، لوگوں کو صحیح راسته دکھا رهے هیں، دعوت و تبلیغ کا کام کر رهے هیں، کتاب و حکمت کی تعلیم دے رهے هیں، تزکیه نفس کر رهے هیں اور امر بالمعروف اور نهی عن المنکر کی ڈیوٹی سرانجام دے رهے هیں۔ قرآن کی اس آیت کے اس مطلب کا تعین بهی قرآن مجید کی هی دیگر آیات کرتی هیں۔ مثلاً اللّٰه تعالیٰ ارشاد فرماتے هیں:

﴿ یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (المآئدة=٥ :٦٧)

"اے رسول! جو کچھ بهی آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا هے (وه لوگوں تك) پهنچا دیجیے۔"

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (النَّحل=١٦ :١٢٥)

"اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو ح کمت اور بهترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے اس طریقے سے ب حث کرو جو سب سے اچھا هے۔"

﴿یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (المدثر=٧٤ :١-٣)

"اے کپڑا اوڑھنے والے ۝اٹھ کھڑا هو (اور لوگوں) کو ڈرائیے۝اور اپنے رب

پیدا کرلیں تو ان پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ لہٰذا درج بالا وجوہ کی بناء پر یہ معیار درست نہیں۔

➢ کی کبریائی بیان کیجیےo"

دوسری مثال: سورۃ الحجر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ o عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَo﴾ (الحجر=۱۵: ۹۲، ۹۳)

"(اے نبی ﷺ!) تیرے پروردگار کی قسم ہے! ہم ان سب سے (قیامت کے روز) ضرور سوال کریں گےo اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھےo"

لیکن...... سورۃ الرحمن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِo﴾ (الرحمن=۵۵: ۳۹۔۴۱)

"اس (قیامت والے) دن کسی انسان اور کسی جن سے اس کے گناہوں کے متعلق سوال نہ کیا جائے گاo پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گےo مجرم اپنی علامت سے پہچان لیے جائیں گے اور ان کی پیشانیوں کے بالوں اور قدموں سے پکڑ لیے جائیں گےo(اور انہیں جہنم میں جھونک دیا جائے گا)"

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ضرور سوال کریں گے۔ جب کہ دوسری آیت میں اللہ فرماتے ہیں ہم سوال نہیں کریں گے۔ بظاہر کتنا واضح تضاد اور تعارض ہے۔ مگر دونوں آیتوں کے معنی و مفہوم کو سمجھ لیں تو یہ تضاد دور ہو جاتا ہے۔ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم قیامت کے روز سب لوگوں سے ان کے اعمال کے متعلق ضرور سوال کریں گے کہ بتاؤ تم نے یہ جرم اور گناہ کیوں کیا؟ اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ دریافت نہیں کریں گے کہ تم نے کیا کیا گناہ اور جرم کیا۔ بلکہ ان کے اعمال نامے اور مکمل ریکارڈ تو پہلے ہی تیاری حالت میں ہمارے پاس ہوں گے۔ پس ان کی شکلوں اور حلیوں سے پہچان کر اور پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینکا جاتا رہے گا۔ المختصر قیامت کے روز یہ سوال ہو گا کہ جرم کیوں کیا؟ ➢

معیار دوم، رسول اللہ ﷺ کی توہین:

اب دیکھئے اگر قرآن کی کسی آیت سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت بظاہر داغدار معلوم ہوتی ہو تو اس کا کیا حل ہوگا؟ کیا پھر قرآن کی اس آیت کو بھی (نعوذ باللہ) مردود سمجھا جائے گا۔ مثلاً قرآن میں ہے:

① ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝﴾ (عبس=۸۰:۱-۲)

''اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیاo کہ اس کے پاس ایک نابینا آیاo''

اب دیکھئے! یہ آیت ایک اخلاقی عیب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جس سے آپ کی سیرت داغدار ہوتی ہے۔

② ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ۝﴾ (الفتح=۴۸:۱-۲)

''بے شک ہم نے آپ کو فتح مبین دے دی ہےo تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دےo''

➤ یہ سوال نہیں ہو گا کہ جرم کیا کیا؟ اس طرح دونوں آیات کا تعارض دور ہو جاتا ہے۔اس قسم کی قرآن مجید میں بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ یہ دو مثالیں فقط نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔علی ھذا القیاس اگر کہیں کوئی صحیح حدیث ،قرآن کی آیت سے متعارض و متضاد نظر آئے تو ان کے تعارض کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔ قرآن و سنت کے دیگر دلائل ملحوظ رکھ کر دونوں کا ایسا معنی کیا جائے گا کہ دونوں پر عمل ممکن ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی صحیح حدیث قرآن کی کسی آیت کے مخالف نہیں ہو سکتی۔(ابوعمار)

ان دونوں آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے کچھ نہ کچھ گناہ بھی سرزد ہوئے ہیں۔لہٰذا یہ آیت بھی آپ کی سیرت مقدسہ کو داغدار کر رہی ہے۔

③ ﴿وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا﴾

(بنی اسرائیل=۱۷:۷٤)

''اور اگر ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم کسی قدر ان (مشرکین مکہ) کی طرف مائل ہو ہی چلے تھےo''

بتایے! کیا یہ آیت رسول اکرم ﷺ کے کسی کمزور پہلو کی نشاندہی نہیں کر رہی؟ اور اس سے آپ ﷺ کی سیرت داغدار نہیں ہوتی؟

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہی باتیں قرآنی آیات کے بجائے احادیث میں مذکور ہوتی تو وہ یقیناً اس معیار کے مطابق مردود قرار پاتیں۔لہٰذا معلوم ہوا کہ ''طلوع اسلام'' کا یہ قائم کردہ معیار بھی درست نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ بھول چوک اور لغزش انسانی فطرت میں داخل ہے اور اس سے انبیاء بھی مبرا نہ تھے۔انبیاء کی عصمت کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کی لغزشوں پر انھیں مطلع کر دیا جاتا ہے۔

معیار سوم ،توہین صحابہ رضی اللہ عنہم:

① سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک راز کی بات کا ذکر کرتے ہوئے دو ازواج مطہرات کے سلسلہ میں فرمایا:

﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ (التَّحریم-٦٦:٤)

''اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرلو تو (یہی بہتر ہے ورنہ) تمہارے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔''

② سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے دنیوی زندگی اور اس کی زیب وزینت کی طرف میلان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَ أُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾ (الاحزاب=٣٣:٢٨)

''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دے دوں اور تمہیں اچھی طرح رخصت کر دوں o''

گویا ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا یہ میلان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں اتنا ناپسندیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اگر وہ اپنے اس میلان سے باز نہیں آتیں تو ان سب کو طلاق دے کر رخصت کر دو۔ بتلایئے! یہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی صریح توہین نہیں؟

اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بات سنئے! کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

① ﴿ وَ إِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا إِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَائِمًا ﴾ (الجمعة=٦٢:١١)

''اور یہ لوگ جب کوئی تجارت یا تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں o''

② ﴿ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ ﴾

(الأنفال=٨: ٥-٦)

''اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کو گراں سمجھتی تھی۔ وہ اس حق کے بارے میں اس کے بعد کہ اس کا ظہور ہو گیا تھا، آپ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں ۝''

③ ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ﴾ (البقرة=٢: ١٨٦)

''اللہ تعالیٰ نے معلوم کر لیا تم اپنی جانوں سے خیانت کرتے تھے۔ پس اللہ رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہوا اور تمہارا قصور معاف فرما دیا۔''

④ ﴿ حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ (آل عمران=٣: ١٥٢)

''یہاں تک کہ تم نے (جنگ اُحد میں) بزدلی دکھائی اور حکم (رسول ﷺ) میں جھگڑا کیا اور اپنی پسندیدہ چیز (فتح کے آثار) دیکھ لینے کے بعد تم نے (رسول ﷺ کی) نافرمانی کی۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خطبہ جمعہ کے وقت تجارت کا مال یا کوئی تماشا دیکھ کر نبی اکرم ﷺ کو کھڑا چھوڑ جاتے تھے۔ بعض جہاد کو ناپسند کرتے تھے۔ بعض ماہ رمضان میں رات کو مباشرت کر لیتے تھے اور بعض نے جنگ احد میں بزدلی بھی

دکھائی اور رسول ﷺ کی نافرمانی بھی کی تھی۔ اب دیکھئے ان واقعات سے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی توہین ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر طلوع اسلام کا قائم کردہ یہ معیار اتنا ہی اہم تھا تو قرآن نے ان واقعات کا ذکر کیوں کر دیا؟ اب اگر ان ہی واقعات کی تشریح یا ایسی کوئی دوسری بات طلوع اسلام ذخیرۂ احادیث میں دیکھ پاتا تو اسے محض اس بناء پر موضوع قرار دیتا کہ اس سے صحابہ کی توہین ہوتی ہے یہ کہاں کا انصاف ہے؟ لہٰذا طلوع اسلام کا قائم کردہ یہ معیار بھی درست نہیں۔

روایت حدیث کے یہ تین معیار تو پرویز صاحب نے بتلائے ہیں اور ان کے استاد حافظ اسلم صاحب جہاں مرویات ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہیں، تو فرماتے ہیں:

''ان میں سے بہت سی حدیثیں ایسی ہیں کہ ان پر علم و عقل کی رو سے گرفت (۳۵) کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے۔ اس لیے ہمارا ضمیر قبول نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی روایتیں انھوں (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) نے بیان کی ہوں گی۔'' (مقام حدیث صفحہ نمبر: ۸۲)

گویا حافظ اسلم صاحب نے چوتھا معیار یہ بتلایا کہ وہ علم کے خلاف نہ ہو۔ علم سے ان کی مراد قرآنی علوم نہیں۔ قرآن کا ذکر تو ہو چکا۔ اس لیے ان کی مراد جدید سائنسی علوم یا مشاہدہ اور تجربہ وغیرہ کا علم ہی ہو سکتے ہیں۔ جب کہ پانچواں معیار بتلایا کہ وہ عقل کے خلاف نہ ہو۔

معیار چہارم، خلافِ علم نہ ہو:

اب دیکھئے! جہاں تک چوتھے معیار کا تعلق ہے تو قرآن میں مذکور تمام معجزات انبیاء

(۳۵) اس گرفت کے لیے دیکھئے: اس کتاب کا مضمون ''بخاری کی قابل اعتراض احادیث''

اور مَا بَعْدَ الطَّبِیْعَات امور، جدید سائنسی علوم یا مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہیں۔ اب منکرین حدیث کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن میں مذکور تمام معجزات اور مَا بَعْدَ الطَّبِیْعَات امور کا علی الاطلاق انکار تو نہیں کرتے، مگر ان کی نہایت بھونڈی تاویلات پیش کر دیتے ہیں جن پر علم و عقل کی رو سے بھی شدید گرفت کی جاسکتی ہے اور بہت سے مقامات پر ہم نے بھی کی ہے۔ لیکن ایسے ہی واقعات آپ حدیث میں دیکھ پاتے ہیں تو ان احادیث کو موضوع قرار دے کر انکار کر دیتے ہیں۔

معیار پنجم، خلافِ عقل نہ ہو:

یہ معیار محدثین نے بھی قائم کیا ہے لیکن اس معیار پر پرکھنے کے بعد محدثین جس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ منکرین حدیث کی عقلیں انھیں بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں فرقوں کی عقل میں فرق ہے۔ محدثین اپنی عقل کو وحی الٰہی کے تابع رکھتے اور عقل کا جائز استعمال کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل ہم دوسرے باب میں پیش کر آئے ہیں۔ لیکن طلوع اسلام عقل کی برتری اور تفوق کا قائل ہے اور یہ چیز اسے معتزلین سے ورثہ میں ملی ہے۔ اگرچہ صوفیہ کی طرح ''طلوع اسلام'' کا بھی زبانی دعویٰ یہی ہے:

> ''تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی رہنمائی کے لیے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔'' (طلوع اسلام کا مسلک، شق نمبر:۱)

مگر عملاً وہ وحی کے سورج کو عقل کا چراغ دکھانے سے باز نہیں آتے۔ تفصیل کے

لیے دیکھئے: میری مفصل تصنیف ''آئینہ پرویزیت'' کا حصہ دوم ''طلوع اسلام کے نظریات'' اور حصہ ششم ''طلوع اسلام کا اسلام''

قرآن کی جن آیات میں عقل و بصیرت سے کام لینے کا ذکر ہے یہ حضرات صرف انھیں آیات کا ذکر کرتے ہیں انھیں بار بار دہرایا کرتے ہیں اور جن آیات میں عقل کو وحی کے تابع رکھنے کی ہدایت ہے، ان کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝﴾ (الأحزاب=٣٣: ٣٦)

''جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو اس کے بعد مومن مرد یا عورت کا کچھ اختیار باقی نہیں رہتا۔ (یعنی اس کے بعد عقل کا استعمال حرام ہو جاتا ہے) (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۝''

پھر مومنوں کو اللہ تعالیٰ یہ حکم بھی دیں:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝﴾

(النساء = ٤: ٦٥)

''اگر وہ اپنے اختلافات میں رسول اللہ ﷺ کو قاضی نہ بنائیں۔ پھر ان کا فیصلہ بلا چون و چرا اور برضا و رغبت تسلیم نہ کریں تو وہ مومن ہو ہی نہیں سکتے۝''

اس طرح فرمان نبوی ﷺ کے سامنے بھی عقل کے استعمال پر اتنی شدید پابندی لگا دی گئی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود طلوع اسلام کو داد دیجیے کہ اس نے وحی الٰہی میں عقل کی مداخلت کے لیے قرآن ہی سے ایک عدد دلیل بھی مہیا فرما دی، جو یہ ہے:

عقل کے استعمال کی دلیل:

اور وہ (یعنی قرآن) مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾

(الفرقان=۲۵:۷۳)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) آیات الٰہی بھی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گرتے ○''

(بلکہ عقل وفکر سے کام لے کر انھیں قبول واختیار کرتے ہیں) (مقام حدیث: ٤)

اب دیکھیے! ترجمہ میں خط کشیدہ تمام الفاظ پرویز صاحب کی طرف سے یا تو اضافہ ہیں یا مغالطے ہیں۔

① ﴿ذُكِّرُوْا﴾ کا ترجمہ '' پیش کی جائیں'' غلط ہے۔ پیش کرنا کے لیے لفظ ''عَرَضَ'' آتا ہے۔

﴿ذُكِّرُوْا﴾ کا صحیح ترجمہ ''نصیحت کیے جاتے ہیں'' ہوگا۔

② آخر میں پرویز صاحب نے جو اضافہ فرمایا: (بلکہ عقل وفکر سے کام لے کر انھیں قبول واختیار کرتے ہیں) اس میں '' قبول واختیار'' کا اضافہ کسی لفظ سے بھی مستنبط نہیں ہوتا۔ ﴿صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ کے الفاظ سے ''غور سے سننا اور اس میں فکر کرنا

''تو مستنبط ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا جب ان کو اپنے پروردگار کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ بہرے اور اندھے نہیں ہورہتے (بلکہ وہ ان آیات کو غور وفکر سے سنتے ہیں) اس ترجمہ میں وحی الٰہی میں عقل کی مداخلت کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔ جب کہ پرویز صاحب کے طبع زاد ترجمہ سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ آیات الٰہی میں عقل وفکر سے کام لو۔ پھر اگر قبول واختیار کرنے کی چیز ہو تو قبول واختیار کرو، ورنہ رد کردو۔ یہ کام ایک کافر کا تو ہوسکتا ہے۔ مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں ﴿ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ﴾ دراصل اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ''ٹس سے مس نہ ہونا۔'' یعنی مومنوں کی یہ حالت نہیں ہوتی کہ وہ آیات الٰہی سے نصیحت کیے جائیں تو وہ ٹس سے مس [۲۶] بھی نہ ہوں، بلکہ ان آیات کو غور سے سنتے اور دل میں جگہ دیتے ہیں۔ اب اگر اس آیت سے پرویز صاحب وحی پر عقل کی برتری ثابت کر دکھائیں تو اسے ان کا کرشمہ ہی سمجھنا چاہیے۔ پھر جب آپ قرآن میں عقل کا اس طرح استعمال کر سکتے ہیں تو احادیث کب ان کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں؟

« اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ »[۲۷]

---

[۲۶] واضح رھے کہ مفہوم القرآن کے مقدمہ میں پرویز صاحب نے خود اس آیت کو ان آیات میں شمار کیا ھے جن کا لفظی ترجمہ ھو ھی نہیں سکتا۔

[۲۷] ترجمہ: ''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ھیں۔ جس کے فضل وکرم سے اچھے اچھے کام پایۂ تکمیل کو پہنچتے ھیں۔''
حوالہ= ان کلمات کو امام حاکم نے اَلْمُسْتَدْرَكُ عَلَى الصَّحِيْحَيْنِ میں روایت کیا ھے كِتَابُ الدُّعَاءِ وَالتَّكْبِيْرِ وَ التَّسْبِيْحِ وَالذِّكْرِ، الحديث: ۱۸٤۰۔

➤ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے "حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔ دیکھئے: مُسْتَدْرِكُ عَلَى الصَّحِيْحَيْنِ بتَحْقِيْقِ مُصْطَفٰى عَبْدُ الْقَادِرُ عَطَا۔ ان کلمات کو ابن سنی نے عَمَلُ الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ میں بھی روایت کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ دیکھئے صَحِيْحُ الْجَامع: ٤:١٠٢

((ائْذَنْ لِيْ أَيُّهَا الْأَمِيْرُ ! أُحَدِّثْكَ قَوْلًا قَامَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْغَدَ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ أُذُنَايَ ، وَ وَعَاهُ قَلْبِيْ وَ أَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ ، حِيْنَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمِدَ اللّٰهَ وَ أَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ :((إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَ لَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِإِمْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَ لَا يَعْضِدُ بِهَا شَجَرَةً فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْهَا فَقُوْلُوْا : إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُوْلِهِ وَ لَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ ، وَ إِنَّمَا أَذِنَ لِيْ فِيْهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ ، وَ لْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))



ایک دھوکہ

از قلم: محترم الشیخ محمد اسماعیل السلفی رحمہ اللہ

بعض منکرین سنت نے بڑی عنایت فرمائی وہ فرماتے ہیں کہ ہم احادیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ یہ تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور مقدس تاریخی دستاویز۔

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ﴾ (الکھف=۱۸: ۵)

"بہت بڑا کلمہ ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہا ہے"

مقام نبوت کو سمجھ لینے کے بعد اس کا مطلب انکار نبوت کے سوا کچھ نہیں۔ بلکہ رسول اکرم ﷺ کی انتہائی توہین ہے۔ اس لفظی ملمع سازی کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کا مقام ابن خلدون، ابن جریر، ابن کثیر اور دیگر مؤرخین کے پس و پیش ہوگا۔ ہر آدمی کو اس پر بحث و تنقید کا حق ہوگا۔ پیغمبر تاریخی مباحث کا تختۂ مشق ہوگا۔ بحث و نظر کی موشگافیاں نبوت کے ماحول پر محیط ہوں گی۔ یہ مقام تمام علماء کا ہے بلکہ بحیثیت مورخ یورپ کے ملحدوں نے بہترین تاریخی سرمایہ علم کی منڈیوں میں بکھیرا ہے جو اہل نظر کے لیے دعوت فکر کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

ہمارے یہ دوست (اگر شرم و حیا دنیا سے نابود نہیں ہو گئی تو) غور کریں کہ یہ کونسا

مقام ہے جو وہ رسول اکرم ﷺ کو عنایت فرما رہے ہیں۔ ایک شخص اپنے باپ کے متعلق کہتا ہے کہ میں اس کا بیٹا تو نہیں لیکن ویسے وہ شریف آدمی ہے۔ یورپ کے اکثر بے دین رسول اکرم ﷺ کو مقدس انسان سمجھتے ہیں۔ لیکن پیغمبر نہیں سمجھتے۔ یہی حیثیت حضرات اہل قرآن نے انبیاء کو عنایت فرمائی ہے۔ وہ دیانت داری سے سوچیں کہ مقام نبوت اور عام علماء کے مقام میں کیا فرق رہا۔

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِۦٓ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ﴾ (النور=٢٤: ٦٣)

"ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اس (نبی ﷺ) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔ کہیں انھیں کوئی آزمائش نہ آپہنچے یا انھیں کوئی دردناک عذاب نہ آلے ٥"

اقتباس از حجیت حدیث صفحہ: ١٦٧ مطبوعہ فاران اکیڈمی اردو بازار لاہور۔

